کُندن



راجندر سنگھ بیدی

کندن

راجندر سنگھ بیدی کی دیگر تصانیف

۱۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

۲۔ بے جان چیزیں

۳۔ بیدی کے افسانے

۴۔ چلتے پھرتے چہرے

۵۔ سات کھیل

کُندن

راجندر سنگھ بیدی

مکتبۂ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— منظور پریس لاہور
قیمت ——— ۱۰/- روپے

فہرست

راجہ اور راجندر

راجندر سنگھ بیدی صاحب کا نام شاید آپ نے سُنا ہو گا نہیں بھی سُنا تو کوئی ہرج نہیں، آخر اس میں شرمانے کی کیا بات ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، سب قصور بیدی صاحب کا ہے جو ابھی تک پورے ملک سے اپنے آپ کو متعارف نہ کرا سکے، اور اب کیا متعارف کرائیں گے۔

کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ لڑکے! ان حرکتوں سے باز آ جا، اور کچھ کر! نہیں تو ایک دن گمنامی کی موت مر جائے گا، لیکن دنیائے ناپائیدار میں نام پیدا کرنے کا کیا فائدہ دوسری دنیا میں نام پیدا کرنا چاہیئے دنیا کا چمن تو لو نہی رہے گا، اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے ؎

دو دن کر لے غٹر غوں غوں دنیا کیوتر خانہ ہے
تھوڑا ہنسنا تھوڑا رونا پھر اوپر اڑ جانا ہے

صاحب! افسانوں اور افسانوں کے خود ساختہ کرداروں سے زیادہ اہم وہ کردار ہیں جو خدا نے زندگی کے اسٹیج پر ان کی جیب میں کچھ پیسے ڈالے بغیر بھیج دیئے ہیں۔ ہمیں رازقِ مطلق کا حق ادا کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ان کی جیب میں کچھ نہ کچھ ڈالتے رہنا چاہیئے۔

آپ اب ازراہ مکرم وادب نوازی، افسانہ نگاری کے مسئلے پر تھوڑی دیر

کے لئے لعنت بھیج دیجئے اور بیدی صاحب سے ملئے۔

بیدی صاحب ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوں نہ ہوں ملک کے ایک خاص طبقے میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز ہیں، سچ پوچھئے تو یہ خاص طبقہ شاعروں اور ادیبوں کے طبقے سے بدرجہا زیادہ اہم اور خوشحال ہے اور اس کی خوشحالی اور اہمیت کے زیادہ تر ذمہ دار خود بیدی صاحب ہیں اور جب تک زندہ ہیں (خدا انہیں عمر خضر عطا فرمائے) اس طبقے کے لاکھوں افراد کبھی بھوکے نہ مر سکیں گے۔

آپ سوچیں گے کہ آخر ملک کا وہ کون سا طبقہ ہے جس کے بیدی صاحب دلوانے ہیں، کانگریسی؟ نہیں۔ مہاسبھائی؟ نہیں جن سنگھی؟ نہیں، نیشنلسٹ؟ نہیں، ہوچی؟ نہیں چلیے اب میں آپ کو زیادہ زحمت انتظار نہیں دوں گا۔

آپ لوگ یہ سن کر شاید خوش ہی ہوں گے کہ بیدی صاحب کی یہ محبوب جماعت ملک کے لچوں، لفنگوں، بیکاروں اور نکموں کا عظیم الشان طبقہ ہے۔ بیدی صاحب کے تمام دوست اور دشمن اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید یہ خاکسار بھی بیدی صاحب کے...... متعلق کچھ کہنے پر میں نے کمر ہمت تو باندھ لی ہے مگر سوچتا ہوں کہ ان کے متعلق کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں۔ سچ پوچھئے تو بیدی صاحب کا دوست ہونے کے باوجود میں ان کی عظمتوں سے کماحقہ واقف نہیں قلم بار بار کچھ سوچ کر رک جاتا ہے، سمجھ لیجئے کہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ کئی دوسرے بڑے بڑے کام کرنے کے علاوہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "ایک چادر میلی سی" سائبیریا میں بہت پاپولر ہوا تھا جونہی یہ افسانہ سائبیرین زبان میں منتقل ہوا۔ اہل سائبیریا میں سنسنی پھیل گئی اور انہوں نے

اپنے ریفریجریٹروں کی دھوں پر انگلی رکھ کر قسم کھائی کہ آئندہ ہم کبھی اپنی میلی چادریں نہ دھوئیں گے صرف اسی افسانے کو پڑھا کریں گے اور کرشن چندر کا کوئی افسانہ سائیبیریں زبان میں منتقل نہ ہونے دیں گے۔

پچھلے دنوں ایک روسی ادیب بیدی صاحب سے انٹرویو لینے آیا تو اس نے علاوہ دوسرے سوالوں کے ایک سوال یہ بھی پوچھا کہ مسٹر بیدی! آپ نے صاف دل اور صاف باطن ہونے کے باوجود اپنے اس افسانے کا نام "ایک چادر اجلی سی" کے بجائے "ایک چادر میلی سی" کیوں رکھا؟"

بیدی صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: "موسیو! ہندوستان کے زیادہ تر لوگ غریب ہیں، ان کے پاس کپڑے دھونے کے لئے صابن نہیں ہوتا، ان کی دل شکنی کا امکان تھا، اس لئے میں نے افسانے کا نام "ایک چادر میلی سی" رکھنا مناسب سمجھا، جب ہندوستان خوشحال ہو جائے گا تو آنے والی نسلیں خود میرے افسانے کا نام بدل دیں گی۔" یہ کہہ کر بیدی صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔

بیدی صاحب کی حالت دیکھ کر اور ان کا دلیرانہ جواب سن کر انٹرویو لینے والے پر بھی رقت اور وحشت کا دورہ پڑ گیا، اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور اپنے سر میں بہت سی خاک اور کپڑوں پر بہت سی راکھ مل لی، اپنا سوٹ اپنی ٹائی، اپنا بوٹ ایک غریب کمیونسٹ مزدور کو پیش کر کے بیدی صاحب کی ایک چڈی پہن لی بیدی صاحب نے بڑھ کر اسے گلے لگایا، دونوں کمیونسٹ دوست ایک دوسرے سے ہمکنار ہو کر کئی گھنٹوں تک زار زار روتے رہے اس کے بعد یکایک کمیونسٹ دوست "ورکرز" کا نعرہ لگا کر اٹھا اور چڈی سمیت روس کی سرزمین کو پیدل

بھاگ گیا،

بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانیے کیا یاد آیا،

بحیثیت دوست مجھے راجندر سنگھ بیدی صاحب کے بارے میں صرف ایک ہی بات قطعی طور پر معلوم ہے وہ یہ کہ بیدی صاحب بہت سی قابل اعتراض خوبیوں کے مالک ہیں، ان خوبیوں کو بعض لوگ صریحاً خرابیاں بھی کہہ سکتے ہیں یہ اپنا اپنا ذوق ہے اور بھارت کی سیکولر حکومت میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جیسی چاہے خوبیاں یا خرابیاں اپنے اندر پیدا کرے،

بیدی صاحب بعض لوگوں کے نزدیک خوش قسمتی ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک بدقسمتی سے بڑے ہی بدقسمت واقع ہوئے ہیں، بدقسمتی کا نام انہوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے "خوش قسمتی" رکھ لیا ہے اور یہ بھی کوئی بری بات نہیں،

بیدی صاحب نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "اس لحاظ سے میں بڑا ہی خوش قسمت ہوں کہ میرا کوئی دوست یا دشمن ایسا نہیں جو کم از کم پانچ سال تک میرے یہاں مہمان نہ رہا ہو۔ ان کے دوست بظاہر سوٹ پہننے والے ٹائی لگانے والے، تعلیم یافتہ انسان ہیں مگر باطن کوئی موچی ہے کوئی چمار ہے اور کوئی لوہار، میرا مقصد خدانخواستہ کسی پیشے کی تذلیل کرنا نہیں، شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نویسی بھی تو کچھ ایسے ہی پیشے ہیں۔

میرا مطلب صرف یہ ہے کہ بیدی صاحب کے ان بے شمار پیارے دوستوں کی مہمان نوازی، مستقل رہائش کھانے پینے اور جیب خرچ کا انتظام بھی بیدی صاحب کے ذمے ہے۔ میں خود بھی سات آٹھ سال بیدی صاحب کا مستقل مہمان

رہ چکا ہوں۔

بیدی صاحب کے یہاں کوئی مہمان زیادہ سے زیادہ پانچ سال تک رہ سکتا ہے۔ اگر پھر بھی از راہِ محبت ان کا دامن نہ چھوڑنا چاہے تو بیدی صاحب اسے نیا مکان کرائے پر لے دیتے ہیں اور ہر ماہ اسے خرچ کے لئے ایک خاص رقم پہنچا دی جاتی ہے جسے عموماً پنشن کہا جاتا ہے۔

بیدی صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ لفظ "نہیں" گنگا کی لغت میں لکھا ہے، چنانچہ اہلِ کمال اس کے اس اصول سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کوئی عمر بھر کے لئے ان کا مہمان بن جاتا ہے، کوئی کہتا ہے "میں مہمان بن کر آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میرا حصہ ہر ماہ فلاں شہر، فلاں پتے پر بھیج دیا کیجئے" کوئی ان کی جیبوں کی تلاشی لے کر آنے پائیاں تک نکال لے جاتا ہے۔ کوئی ان کی بنک کی پاس بک نکال کر سادہ چیک پر ان سے دستخط کرا کے رقم خود بھر لیتا ہے وہ کسی سے "نہیں" نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ سردار راجندر سنگھ بیدی کے بجائے بعض لوگ انہیں سردار مروت سنگھ بیدی بھی کہتے ہیں۔

بیدی صاحب ان دنوں بہت تلاش ہوتے ہیں اور ان کا کوئی دوست یا دشمن اپنے گھر کے دردناک حالات سنا کر اس سے رحم کا مطالب ہوتا ہے تو وہ جب بھی اسے اپنے در سے ناکام نہیں لوٹاتے۔ کہیں سے ہزار دو ہزار روپیہ قرض لے کر اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے معذرت بھی کرتے ہیں کہ بڑی کوشش کی مگر دو ہزار سے زیادہ رقم کہیں سے نہ مل سکی۔ اگر مانگنے والے کی حالت پر انہیں بہت ہی رحم آجائے تو روپیہ دینے کے بعد اظہارِ افسوس کے طور پر اس

سے گلے مل مل کر خوب رو بھی لیتے ہیں، اکثر رو رو کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور قرض لینے والا پیسے جیب میں ڈال کر انہیں اسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر چمپت ہو جاتا ہے۔

بیدی صاحب کے گھر میں جب مہمان دوستوں یا مہمان عزیزوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ بال بچوں سمیت یا تو بھوکے رہتے ہیں یا بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں، اب اتنا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرے۔

راجندر سنگھ بیدی صاحب کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ایک کھاتے پیتے آدمی ہیں مشہور رشاید وہ ہوں گے لیکن انہیں کھاتے یا پیتے میں نے کبھی نہیں دیکھا البتہ ان کے مہمانوں کو دن میں پانچ چھ مرتبہ کھاتے پیتے ضرور دیکھا ہے، وہ چھپ چھپ کر کھاتے یا پیتے ہوں تو دوسری بات ہے۔

بیدی صاحب کا گھرانہ بڑا پیارا گھرانہ ہے، ان کی ایک بچی تو بہت چھوٹی ہے جو شاید تعلیم حاصل کرتی ہے۔ بڑی بچی کی شادی کر دی گئی ہے، مسز بیدی ابھی اس کی شادی کی مخالف تھیں وہ اسے مزید تعلیم دلانا چاہتی تھیں لیکن ایک دن بیٹھے بیٹھے جانے بیدی صاحب کو کیا خیال آیا کہ اس بچی کی شادی کے درپے ہو گئے، کہنے لگے، مجھے خیال آیا ہے کہ اس بچی کی شادی کر دینا ضروری ہو گیا ہے، اگر اس کی شادی ہو جائے تو اس کے حصے کا کھانا اور کپڑا کسی غریب بچی کو مل سکتا ہے، ایشیا کی ہر بچی میری اپنی بچی ہے، اس بچی کو میں نے کافی لکھا پڑھا دیا ہے، پالا پوسا ہے، وہ اپنا حق لے چکی ہے اب دوسروں کی باری ہے چنانچہ اس بچی کی شادی کر دی گئی، ان کی

دوسری بچی دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ "اے خدا مجھے بہت جلدی بڑا نہ کر دینا ورنہ ڈیڈی مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔

بیدی صاحب کے دو صاحبزادے ہیں۔ ایک ہو بہو سردار راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ اس بچے میں اور ایک گملے میں کوئی فرق نہیں بڑا ہی پیارا اور معصوم ہے۔ بیدی صاحب نے اسے ایک کمرے میں مقفل رکھ کر پالا ہے یہ بچہ ماڈرن دنیا اور اس کے لوازم سے بالکل بے خبر ہے۔ اس بچے نے جواب تک ماشاء اللہ جوان بھی ہو گیا ہے۔ نہ ہوائی جہاز دیکھا ہے۔ نہ ٹرینیں نہ بسیں نہ کرشن چندر۔ ایک مرتبہ بیدی صاحب صبح صبح اسے سیر کرانے لے گئے تو راستے میں ایک مرغا نظر پڑا بدقسمتی سے مرغے نے اذان دیدی۔ برخوردار ڈر کر بیدی صاحب سے چمٹ گیا۔ اور کہنے لگا "ڈیڈی یہ کون صاحب ہیں؟ اور اتنے زور زور سے کیوں رو رہے ہیں؟ کیا انہیں بھی پیسے کی ضرورت ہے۔

بیدی صاحب بغیر جواب دیئے جلدی سے اسے گھر گھسیٹ لائے۔ اور اس کو اس کمرے میں مقفل کر دیا جس میں اس بچے نے اپنے بچپن کے بہت سے دن گزارے تھے کہ اسے زمانے کی ہوا نہ لگ جائے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس لڑکے نے ایک دن اپنے گھر کے قید خانے کی کھڑکی سے ہاتھی گزرتے دیکھ لیا تو بیچارہ وہیں بے ہوش ہو گیا کہ جانے کیا چیز ہے۔

بیدی صاحب کے دوستوں کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے بیدی صاحب کے قدموں پر سر رکھ کر اسے "قید خانے" سے نجات دلائی اور کئی دن کے بحث مباحثے کے بعد بیدی صاحب کو قائل کر دیا کہ اس بچے کے بیٹے

اسکول جا کر تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے، بیدی صاحب نے اس شرط پر لڑکے کو سکول جانے کی اجازت دے دی کہ وہ برقع پہن کر ٹیکسی میں بیٹھ کر اسکول جائے اور برقع پہن کر واپس آئے۔

بیدی صاحب کا دوسرا لڑکا بیس بائیس سال کا دبلا پتلا ہونہار جوان ہے۔ بیدی صاحب نے اسے بھی قید خانے ہی میں پالنے کی کوشش کی تھی لیکن لڑکا بے حد ذہین اور چالاک تھا، منہ پھٹ اور آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک کہ اندھیرے میں آنکھیں کھول دے تو تاریکیاں جگمگا اٹھیں۔ وہ بیدی صاحب کے "قید خانے" میں زیادہ دن نہ رہ سکا۔ ایک دن کمرے کی کھڑکی کی سلاخیں توڑ کر نکل بھاگا، اس لڑکے کا نام سردار نریندر سنگھ بیدی ہے۔ سردار نریندر سنگھ سلمہ نے رات کے ۹½ بجے کے قریب قید خانے سے فرار ہو کر سب سے پہلے ایک ہیر کٹنگ سیلون میں پناہ لی، ایک گھنٹہ بعد جب وہ سیلون سے باہر نکلا تو نہ وہ "سردار" رہا تھا نہ "سنگھ" صرف نریندر بیدی ہو کر رہ گیا تھا، نریندر فارغ البال ہو کر رات کے گیارہ بجے گھر پہنچا، گھر کی دیوار پھاند کر صحن میں کودا، وہاں سے شرم کے مارے منہ چھپاتا ہوا دوڑ کر خواب گاہ میں پہنچا ہی تھا کہ گھر کے لوگوں نے اسے دیکھ لیا نریندر کو کلین شیو اور کلین ہیڈیڈ دیکھ کر گھر کے کسی فرد نے نہ پہچانا گھر کے سب لوگ ہاتھوں میں لکڑیاں لے کر چور چور کہتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے بہترا شور مچایا کہ میں چور نہیں ہوں سردار نریندر سنگھ بیدی ہوں مگر کسی نے اس کی ایک نہ مانی، سب چلا چلا کر کہنے لگے "کیا سردار نریندر سنگھ بیدی ایسا ہوتا ہے؟" اور بیدی صاحب بولے ــ

"بچہ دلاور است و زدے کہ بکف چراغ دارد"
ایک تو چوری کی نیت سے گھر میں کودا، دوسرے کلین شیو ہو کر اپنے
آپ کو سردار کہہ رہا ہے، چار سو بیس کہیں کا"۔
چنانچہ گھر کے سب لوگوں نے اسے نہ پہچانتے ہوئے پولیس کا سٹیشن
بھیج دیا۔ لڑکا ذہین اور چالاک تھا اس نے فوراً پولیس اسٹیشن سے مجھے ٹیلی
فون کیا کہ "میں کیرالا ہیر کٹنگ سیلون میں جاکر فارغ البال ہو گیا ہوں۔ گھر کے لوگوں
نے نہیں پہچانا اور بیدی صاحب چور سمجھ کر مجھے پولیس سٹیشن میں ڈیپارٹ کرا
گئے ہیں۔ ہزاروں چوروں، ڈاکوؤں کو گھر میں پناہ دیتے ہیں اور چونکہ میں گھر
کا چور تھا، اس لئے انہوں نے مجھ پر لنکا ڈھانی ضروری سمجھی اور میرے لئے
سب سے مناسب جگہ پولیس اسٹیشن ہی سمجھ بیٹھے۔ خدا کے لئے آکر میری جان چھڑائیے
میں فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی نریندر کو نہ پہچان
سکا۔ اس وقت پہچانا جب وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔
میں نے اپنے چہرے پر غصے کے نقلی تاثرات پیدا کرتے ہوئے اسے
خوب ڈانٹا اور پھٹکارا، اور کہا" شرم نہیں آتی ایک تو اتنی بری حرکت کر
بیٹھے ہو، دوسرے ڈھٹائی سے اب ہنس بھی رہے ہو"۔
وہ ہنس کر بولا" انکل! میں خوب سمجھتا ہوں۔ آپ اندر سے خوش اور باہر سے
ناراض ہو رہے ہیں۔ میں انڈین مسلمز کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔
بکو نہیں! کہہ کر میں نے اس کی ضمانت دی اور چھڑا لیا۔ اسے اس
کے گھر لے چلا تو وہ بولا۔ انکل! آج رات تو میں آپ ہی کے گھر رہوں گا۔

کل صبح دونوں ساتھ چلیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کے اندھیرے میں میرے ساتھ آپ بھی پٹ جائیں،

دوسرے دن میں نریندر کو اس کے گھر پہنچا آیا۔ اب نریندر بیدی پر گھر کے لوگوں نے خاندان والوں نے اور سوسائٹی نے جو جو ستم کیئے اور مبارکباد کے جو جو خوبصورت ہار پہنائے اس کی تفصیل نریندر ہی سے پوچھئے، نہ پوچھیں تو اور بھی اچھا ہے، سماج کے معاملات میں زیادہ دخل دینا اچھا نہیں ہوتا،

نریندر ایک ذہین، عقلمند، ہوشیار اور عملی جوان ہے، منہ پھٹ اور صاف گو۔ بیدی صاحب نے اس کا نام مرکھنا بیل رکھا ہے۔ وہ اسے ہر وقت غیر مناسب ٹائپ کی نصیحتیں کرتے رہتے ہیں، قسمیں کھا کھا کر اسے دنیا کے غیر فانی ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں، نریندر جواب دیتا ہے کہ "ڈیڈی! اول تو دنیا فانی ہی نہیں ہے، سب پرانے ڈھکوسلے ہیں، اگر دو منٹ کے لئے مان بھی لیا جائے کہ دنیا فانی ہے، تو پھر مجھ کو اور آپ کو اس کی ہر نعمت سے جلد از جلد محظوظ ہو لینا چاہیے

زاں بیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

سب چوروں اور ڈاکوؤں کو اب اپنی شرافت کی قید سے رہائی دے دیجیے، ہماری گورنمنٹ نے ان سب کے لیے ہزاروں جیلیں کھول رکھی ہیں، کیوں نہ ہم انہیں وہاں بھیج کر امن اور چین کی زندگی بسر کریں۔ آخر آپ نے نیک اعمال کر کے روحوں کی بے چینی اور درد و کرب کے سوا کیا حاصل کیا ہے۔ اگر کوروؤں اور پانڈوؤں کے زمانے میں آپ ہوتے تو جنگ مہابھارت نہ ہوتی، اور اگر جنگ مہابھارت نہ ہوتی تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؛ اس کا جواب دنیا بھر کے دانشوروں

سے جاکر پوچھ لیجئے، میں کوئی عقلمندی کی بات کروں گا تو آپ اسے بیوقوفی سمجھیں گے محض اس لئے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں، اگر یہی باتیں ہریش چندر، بکرماجیت یا مہاراجہ اشوک یا مسٹر کینیڈی یا مسٹر خروشچیف آپ سے کہتے تو آپ ان کے پاؤں پکڑ لیتے میں نہیں کہتا کہ میری باتیں سن کر آپ میرے چرن چھوئیں، آپ میرے بزرگ ہیں، بہر حال کم از کم میری عقلمندی کی داد تو دیجئے، اب اپنی زندگی مصیبتوں کے بھنور میں ڈال کر آپ مجھ سے کیوں کہتے ہیں کہ سہ۔

ہم تو ڈوبے ہیں میاں تم کو بھی لے ڈوبیں گے

میں نہیں ڈوبوں گا، نہیں ڈوبوں گا، نہیں ڈوبوں گا اور اگر ڈوبوں گا تو آپ کے ساتھ نہیں، اپنا اپنا سمندر، اپنی اپنی موت۔"

اس قسم کی بے باکانہ اور گستاخانہ تقریریں سن کر بیچارے بیدی صاحب آہ بھر کر خاموش ہو جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ نریندر پاگل ہو گیا ہے اور ایک مرتبہ انہوں نے تھانہ پاگل خانہ کے انچارج کو ٹیلی فون کر کے کچھ باتیں بھی کی تھیں، پاگل خانے کا انچارج اتنا بے وقوف تھا کہ نریندر کے بجائے انہیں لینے کے لیے آ پہنچا۔

بیدی صاحب بائی نریندر کی حالت پر سولہ سولہ آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے امید تھی کہ میرا بیٹا نیکی اور شرافت میں مجھے بھی مات دے دے گا، لیکن افسوس کہ یہ تو دنیا دار نکلا میری تمنا تھی کہ میں اسے گیروے کپڑے پہنا کر کسی تیرتھ استھان بھیج دوں گا جہاں وہ اپنی باقی عمر عبادت اور خلقِ خدا کی خدمت میں گزار دے لیکن یہ تو دنیا دار غنڈہ نکلا، یہ تو فلمیں بنانا چاہتا ہے بیدی صاحب کو اگر دنیا میں کوئی دکھ ہے تو یہی ہے، ویسے انہیں اس قسم کے ہزاروں اور بھی دکھ ہیں لیکن ان

دکھوں کا نام تو انہوں نے سکھ رکھ دیا ہے۔ عزیزم نریندر کا اصرار ہے کہ بیدی صاحب اس کے دکھ کو بھی سمجھ لیں۔

بیدی صاحب کے گھر کا سب سے اہم فرد ان کی بیگم ہیں جنہیں بیدی صاحب نے زبردستی تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ سردار راجندر سنگھ بیدی بنا لیا ہے بہت سے نوکروں کی موجودگی کے باوجود وہ خود کھانا پکاتی ہیں۔ گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی وہ خود ہی انجام دے لیتی ہیں۔ نوکروں سے مہینے میں شاید ایک آدھ معمولی سا کام لے لیا جاتا ہے کیونکہ بیدی صاحب کا حکم ہے کہ "نوکروں کو زیادہ پریشان نہ کیا جائے ممکن ہے ان میں سے کوئی ولی اللہ ہو۔

بیدی صاحب مساوات کے شدت سے قائل ہیں۔ صبح شام کھانا وہ اپنے تین نوکروں اور آیا کے ساتھ ایک خوبصورت میز پر کھاتے ہیں۔ مسز بیدی سالن کی پلیٹیں رکھنے کے بعد گرم گرم چپاتیاں میز پر لاتی جاتی ہیں اور یہ لوگ مزے سے کھاتے جاتے ہیں لیکن یہ نارمل دنوں کی بات ہے لیکن جب گھر میں مہمانوں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ تو بیدی صاحب کو کھانا نہیں دیا جاتا۔ بیدی صاحب کا ہی حکم ہے کہ ان کے حصے کا کھانا مہمانوں کو کھلا دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کھانا کم پڑ جانے کی وجہ سے کوئی مہمان بھوکا رہ جائے اور انہیں بددعا دے بیٹھے۔ ایسے موقعے پر وہ خود اپنے پیٹ پر بلیں سیر کا پتھر باندھ کر سو جاتے ہیں جو پاکستان سے بھاگتے وقت وہ اپنے مکان سے اٹھا لائے تھے۔

جب گھر میں بدتمیز مہمان عین کھانے کے وقت غیر متوقع طور پر دھاوا بول دیتے ہیں تو مسز بیدی پر وہ دن یادہ گھڑیاں قیامت کی ہوتی ہیں۔ بیدی صاحب

مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر باورچی خانے میں چلے جاتے ہیں اور مسز بیبی کو اس قسم کی ہدایات دیتے ہیں ۔

۱ : امبالال دیجی ٹرین ہے۔ اس کے لئے سرف ٹنڈے، گوبھی دال، آلو اور پراٹھے پکا لو۔

۲ : پریتم سنگھ نان دیجی ٹرین ہے اس کے لیے جھٹکے کا گوشت، پراٹھے، کباب، قیمہ، اور کلیجی بھون لو۔

۳ : نفاست علی خاں مرچیں کم کھاتا ہے اس کے لئے کم مرچوں والے چار پانچ سالن کافی ہوں گے، ساتھ ایک میٹھا، بعد میں ایک پان۔

۴ : ضیغم علی خاں بہت زیادہ مرچیں کھاتے ہیں، ان کے لیے قیمے بھری شملے کی مرچیں، ہری مرچیں بھرے پراٹھے، تان تیکھا قورمہ، دس بارہ سیخ کباب اور آدھا سیر مسور کی دال کافی ہوگی۔ یاد رکھنا وہ گن کر اکتالیس پھلکے کھاتے ہیں کہیں بھوکے نہ رہ جائیں۔ احتیاطاً اکاون پھلکے تیار کر لینا۔

۵ : پنڈت ہری سنگھ نارائن پیاز اور لہسن سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے لیے حلوہ پوری، دال چاول اور چاول کی کھیر کافی ہوگی۔ کھانا کھانے کے بعد دو پولسن کی کانی کے دو گلاس پیتے ہیں ملائی والے۔

۶ : تلانند لال صرف سری پائے، اوجڑی اور گردے کھاتے ہیں، کالی گاجر کا حلوہ انہیں بہت پسند ہے لیکن پہلے حلوہ کھاتے ہیں بعد میں سری پائے۔

۷ : روسی مہمان خرشچوخوان کے لیے روسی ڈشیں میری کتاب میں دیکھ کر تیار کر لینا، یا خواجہ احمد عباس کو ٹیلی فون کر کے ترکیبیں معلوم کر لینا

۸ : مسٹر ہیرالڈ انگریز ہیں ، نریندر کو جلدی سے ٹیکسی پر بھیجو کہ فلورا فاؤنٹین جا کر تمہاری سہیلی روزی کو بلا لائے ، اس کی نگرانی میں انگریزی کھانے تیار کر لینا ، مسٹر ہیرالڈ کہتے ہیں کہ میں کھانا کھانے کے بعد انڈین نسوار سونگھوں گا ، اختر الایمان کو ٹیلی فون کر دو کہ تھوڑی سی انڈین نسوار بھیج دے ۔

۹ : بصرے سے مولانا عبدالوہاب صاحب تشریف لائے ہیں ، عرب عموماً بکری کا گوشت نہیں کھاتے ، ان کے لیے کہیں سے بھی اونٹ کا گوشت حاصل کرو ۔ اونٹ کے گوشت کے تیس چالیس کباب ، قورمہ ، بریانی تیار کر لینا ، کچھ نان بازار سے منگوا لینا ، اور ہاں خیال آیا ، ادھر کے لوگ شاید گھوڑے کا گوشت بھی تو کھا لیتے ہیں ، کہیں سے گھوڑے کا گوشت بھی منگوا لو ، ذرا زیادہ ہی منگوا لینا ، میں بھی چکھوں گا کہ کیسا ہوتا ہے ، اونٹ اور گھوڑے کا گوشت نہ ملے تو پڑوسیوں کا اونٹ اور کرشن چندر کا گھوڑا ذبح کرا لینا ، بعد میں ان دونوں حضرات سے نپٹ لوں گا ، کھجور کے حلوے کی ترکیب یاد نہ رہی ہو تو اونٹ کے دودھ کی ربڑی تیار کر لینا ، محلے میں کوئی اونٹنی نہ ہو تو بکری کے دودھ میں تھوڑا نمک ڈال لینا ، اونٹ کا دودھ بن جائے گا ، لیکن یہ بات مولانا عبدالوہاب کو نہ معلوم ہونے لگا ، اگر عبدالوہاب صاحب کو کھانا پسند نہ آیا تو تم لوگ مشرقِ وسطیٰ میں بدنام ہو جاؤ گی اور اگر میں کبھی وہاں گیا عرب مجھ کو تھو تھو کریں گے کہ یہ ہے وہ آدمی جسے کھانا تک پکانا نہیں آتا ، ہاں نوکروں سے زیادہ کام نہ لینا نہ انہیں ڈانٹنا اور دیکھو جب تک کھانا تیار نہیں ہوتا ، ڈرائنگ روم میں چائے ، کافی ، شربت اور پان برابر بھیجتی رہنا ۔ اس وقت بارہ بجے ہیں ، دو بجے

تک کھانا تیار ہو جانا چاہیے ۔،،

عورت چاہے کتنے ہی بڑے دل کی ہو، کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو اسے اپنے کپڑے اور زیور بہت عزیز ہوتے ہیں۔ مادام کیوری کے شوہر نے اپنی بیگم مادام کیوری سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اپنے کچھ زیور اور کپڑے جو نو لوؤں کے رفیوجیوں میں بانٹ دو تو وہ اپنے شوہر کی اس قدر دل آزار بات سن کر سخت برہم ہو گئی تھیں، انہوں نے غصے میں آکر ٹیسٹ ٹیوب اور سائنس روم کے بہت سے شیشے اور لوہے کا سامان توڑ ڈالا تھا، اور اپنے شوہر کو مار پیٹ کر میکے چلی گئی تھیں، مسز بیدی ایک ہندوستانی عورت ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتیں ۔

بیدی صاحب کے گھر پر مانگنے والے اور مانگنے والیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ۔ جیسے ہی دروازے کی گھنٹی بجتی ہے مسز بیدی آہ بھر کر کلیجہ تھام لیتی ہیں، ملنے والی اگر عورت ہے تو وہ یقیناً بیوہ ہوگی اور بیدی صاحب سے مدد لینے آئی ہوگی۔ مسز بیدی چونکہ وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں۔ اندر آنے والی نسوانی آواز سنتے ہی وہ فوراً چائے کی پیالی تیار کر لیتی ہیں اور ایک طشتری میں بسکٹوں کی بجائے اپنی ایک سونے کی انگوٹھی ایک سونے کی چوڑی اور ایک پازیب سجا کر چائے کی پیالی سمیت مہمان کے سامنے رکھ دیتی ہیں، مہمان خاتون چائے کی پیالی "سڑ سڑ" پی جاتی ہیں اور طشتری میں رکھی ہوئی چیزیں پرس میں ڈال کر بیدی صاحب سے ہاتھ ملا کر اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسز بیدی کو صبر کی تلقین کر کے چلی جاتی ہیں ۔

مسز بیدی کی تمام ساڑھیاں، سوٹ، شلواریں، ریشمی کرتے، ممی سینڈلیں، بیدی صاحب محتاج عورتوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں، مسز بیدی بغیر اُف کیے "فوراً" اب

خدا کی راہ میں دے دیتی ہیں، کیونکہ اس کے سوا بیدی صاحب کے راج میں اور کوئی چارہ بھی تو نہیں،

بیدی صاحب کے پاس دوستوں، دشمنوں، بال بچوں اور نیک دل بیگم کے علاوہ ایک مظلوم کار بھی ہے جو دن کے وقت ان کے مہمانوں، دوستوں یا دشمنوں کے کام آتی ہے اور رات کو ان کا بھنگی سیر کرنے کے لئے اسے سمندر کے ساحل پر لے جاتا ہے۔ اسے حکم ہے کہ صبح سات بجے سے پہلے پہلے کار واپس لے آئے، سُنا ہے رات کو وہ کار بھاڑے پر بھی چلا لیتا ہے، اور رات بھر میں ستر بہتر روپے کما لیتا ہے بیدی صاحب بھی اس راز سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی کار کھٹارا بن جائے گی، مگر وہ چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ کیوں کسی بھنگی کا دل توڑا جائے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہریجن تحریک سب سے پہلے بیدی صاحب ہی نے شروع کی تھی،

بیدی صاحب کا بیان ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں انہیں صرف ایک مرتبہ اپنی کار میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے وہ بھی اس وقت جب وہ کار خریدنے گئے تھے۔ اس وقت ان کے خیر خواہوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کار خریدنے جا رہے ہیں، ورنہ کار کے لئے انہوں نے جو روپیہ اکٹھا کیا تھا فوراً ادھار لے لیتے اور بیدی صاحب کو یا تو عمر بھر کار نصیب نہ ہوتی یا اگر ان کے دوست اس روپے سے کار خرید بھی لاتے تو بیدی صاحب کو اپنی کار میں ایک دن بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوتا،

جب وہ کار خریدنے گئے ڈرائیور ان کے ساتھ تھا لیے چارہ کار گیرج سے نکل کر جب سڑک پر پہنچی تو ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بیدی صاحب نے ایک بس سٹاپ کے سامنے رکوا دی اور ایک بہت ہی لمبے کیو میں کھڑے لوگوں کو

لفٹ پیش کی. دس آدمیوں نے بخوشی اپنی خدمات پیش کر دیں، ڈرائیور کے رد کئے
کے باوجود بیدی صاحب نے نو آدمیوں کو کار میں ٹھونس لیا، دسویں کے لئے بالکل
جگہ نہ تھی، بیدی صاحب نے اپنے آپ کو گاڑی کے پیچھے کیریر پر رسے سے
بندھوالیا اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ دسوں مسافروں کو ان کی منزل مقصود پر پہنچا کر
ثواب دارین حاصل کیا جائے۔

اس کام میں پورے پانچ گھنٹے لگ گئے، کیونکہ بمبئی میں فاصلے بہت زیادہ
ہیں لیکن بیدی صاحب کو جب ڈرائیور نے رسے سے کھول کر کیریر سے اتارا تو وہ
بے ہوش ہو چکے تھے، ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے دے کر بڑی مشکل سے
انہیں ہوش میں لایا گیا۔

پانچ گھنٹے بعد جب خالی کار لے کر بیدی صاحب آگے بڑھے تو ایک بس سٹاپ
کے قریب ایک واقف کار کو دیکھ کر کار پھر کھڑی کر لی۔ دس گیارہ مزید مسافروں
نے جو ڈیڑھ گھنٹے سے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے ان سے التجا کی کہ اگر آپ ادھر ہی
کی طرف جا رہے ہیں تو ہمیں بھی بٹھا لیجئے ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑے ہیں مگر کوئی
بس خالی نہیں ملتی۔

بیدی صاحب کسی کو "نہ" نہیں کہہ سکتے انہوں نے پھر دس سواریاں لاد لیں اور خود
کار کی چھت پر بیٹھ گئے جب دھوپ بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکی تو انہوں نے سوا روپے
کی برف خرید کر سر پر رکھ لی۔ وہ ایک تماشا تو بن گئے لیکن ہر ایک کو جہاں جانا تھا وہاں
پہنچا دیا۔ اس طرح کار ہر ایک میل آگے بڑھنے کے بعد ان کے گھر سے بیسیوں میل
دور نکل جاتی تھی، ہر سڑک پر وہ اسی طرح ولی اللہ بن کر اپنی کار میں سفر کرتے رہے

خدا جھوٹ نہ بلوائے انہیں اپنے گھر پہنچنے میں پورے تین دن لگ گئے۔

اس عرصے میں مسز بیدی، بیدی صاحب کے گم ہو جانے کی رپورٹ شہر کے تمام پولیس اسٹیشنوں میں درج کرا چکی تھیں، بیدی صاحب کے بچے بیدی صاحب کی تلاش میں شہر کی تمام فلم کمپنیوں کی خاک چھان چکے تھے، ڈرائیور کی ہندو بیوی نے یہ سمجھ کر کہ وہ ودھوا ہو گئی ہے، اپنے سر میں سیندور کے بجائے راکھ ڈال لی تھی، اپنی کلائیوں پر اینٹیں مار مار کر تمام چوڑیاں ڈال لی تھیں، تمام عزیزوں کو بذریعہ تار اکٹھا کر لیا تھا، اس کی چیخوں کی آواز آسمان سے بھی آگے نکل گئی تھی، کچھ لوگ کہہ رہے تھے، کہ ہائے بچاری کی شادی کو سات ہی دن گزرے تھے، اور اس بچاری کے عزیز کہہ رہے تھے، ڈائن اپنی شادی کے ساتویں دن ہی شوہر کو کھا گئی۔

بیدی صاحب کے قریبی عزیز بیدی صاحب کے گھر آ گئے تھے اور مسز بیدی کو طعنے دے رہے تھے کہ تم بچے کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتیں، بیدی صاحب کے گھر رہنے والے پچیس مہمانوں کا برا حال تھا، وہ کلیجہ تھام کر روتے تھے اور دھاڑیں مار مار کر کہتے تھے، ہائے بیدی جی، ہمارا کیا ہو گا! خدا خدا کر کے بیدی صاحب گھر آئے اور محلے بھر کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔

بیدی صاحب کا کچھ وقت افسانے لکھتے، کچھ لچے لفنگوں کی جھوٹی دردناک داستانیں سننے میں کچھ وقت محتاجوں، فقیروں اور بیواؤں سے رو رو کر گلے ملنے میں کچھ اپنے بال بچوں کو صبر کی تلقین کرنے میں اور کچھ مختلف سیاسی پلیٹ فارموں پر تقریر کرنے میں گزر جاتا ہے۔

بیدی صاحب پرانے راجاؤں اور مہاراجوں ۔۔۔ کی طرح رات کو غریب پرجا کا حال معلوم کرنے نکل جاتے، مہمانوں سے بچے کھچے کچھ پیسے دو ڈھائی آنے ان کی جیب میں ہوں تو مصیبت زدگان میں تقسیم کر آتے ہیں ورنہ رو رو کر ان سے زبانی ہمدردی کر لینے ہی کو کارِ ثواب سمجھ کر واپس آجاتے ہیں ۔

رات بھر اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرنے کے بعد صبح چار بجے کے قریب واپس آکر اپنے گھر کے سامنے سر کے نیچے ایک اینٹ رکھ کر فٹ پاتھ پر سو جاتے ہیں، کیونکہ مہمانوں کی وجہ سے اکثر انہیں گھر میں سونے کو جگہ نہیں ملتی ۔

معزز مہمان صبح آکر انہیں بیدار کرتے ہیں کہ " اٹھیئے، بیدی صاحب! گھر میں خرچ نہیں ہے ۔"

بیدی صاحب چونک کر اٹھ بیٹھتے ہیں، اٹھ کر کپڑوں کی گرد اور مٹی جھاڑتے ہیں، اندر جا کر نہاتے ہیں، چائے کی ایک پیالی پی کر یہ مظلوم اور اداس روح پیسے کی تلاش میں بمبئی کے شور و شغب میں بھٹکنے کے لئے چل جاتی ہے ۔

مندرجہ بالا سطور تک مضمون مکمل تھا، ایک مہینے تک یونہی رکھا رہا کسی پرچے میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔

ایک دن عزیزم نریندر میرے گھر گھبرائے ہوئے آئے ۔ انہوں نے ایک عجیب خبر سنائی ۔ ایسی خبریں تو آئے دن بیدی صاحب کے متعلق سنتے میں آتی رہتی ہیں لیکن اس وقت میرا موڈ کچھ ایسا تھا کہ کچھ کرہی بیٹھنے کو جی چاہا ۔

چنانچہ میں نے اور میرے دوستوں نے سازش کر کے بیدی صاحب کو ہمالیہ کی بلندی سے کوئی پانچ ہزار فٹ نیچے ایک گہرے کھڈ میں پھینک دیا کہ اب

خود ہمیں ان کی صحت نظر نہیں آتی، شروع شروع میں انہوں نے بہتیرے ہاتھ
پاؤں مارے مگر وہ اکیلے تھے اور ہم پانچ کامیابی ہمیں کو نصیب ہوئی۔

اس حادثے کا آغاز اور انجام نریندر کی آمد سے ہوا۔ جب میں نے اس
سے پوچھا کہ اتنے گھبرائے گھبرائے کیوں ہو، کیا بات ہے؟ تو اس نے بتایا
کہ گھر میں صرف پانچ سو روپے رکھے تھے، کہ صبح صبح تین شاعر ہمارے
یہاں آ گئے، پہلے تو انہوں نے اپنی بے شمار سڑی غزلیں سنا کر بیدی صاحب
سے غلط داد وصول کی، مجھے تو اس پر بھی اعتراض تھا مگر اس کے بعد اپنی گھریلو زندگی
کے بہت سے فرضی دردناک افسانے سنا کر بیدی صاحب سے تمام روپے لے گئے
گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں رہنے، میں نے اور ممی نے انہیں بہت سمجھایا کہ کم از
کم دو سو روپے تو گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیجئے مگر وہ نہ مانے اور میں یہاں
آگیا ہوں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب کبھی اپنے گھر میں واپس نہ جاؤں گا۔

میں نے نریندر کو بہت سمجھایا اور کہا کہ "فکر نہ کرو میں نے بیدی صاحب کے جملہ
امراض کا حل سوچ لیا ہے کل صبح صبح میں، کرشن چندر، مہندر ناتھ، خواجہ احمد
عباس اور عصمت چغتائی تمہارے گھر آ رہے ہیں، یا تو بیدی صاحب ٹھیک ہو
یا ہم سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔

دوسرے دن علی الصباح ہم سب بیدی صاحب کے یہاں پہنچ گئے، انہوں
نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا اور حسب توقع معذرت کر کے غسل خانے
میں چلے گئے میں غسل خانے کے دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا، کہ
وہ کب پانی کا ڈونگا بالٹی سے نکال کر سر پر ڈالتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اندازہ کر لیا کہ اس وقت وہ منہ پر صابن مل رہے ہوں گے۔ اور اگر میں غسل خانے کا دروازہ کھول کر بازو بڑھا کر کھونٹی پر سے ان کے کپڑے اتار لوں تو وہ نہ دیکھ سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، میں موقع دیکھ کر آنکھیں بند کیے غسل خانے میں داخل ہو گیا اور چپکے سے کھونٹی پر سے بیدی صاحب کے کپڑے اتار کر بند آنکھوں باہر نکل آیا۔ ے

ایسی چوری کا پتہ خاک لگاتا کوئی

جب وہ نہا کر فارغ ہوئے تو کھونٹی پر نظر ڈالی۔ پہلے تو انہوں نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولے "اے بھائی میرے کپڑے کون چور لے گیا؟" میں نے جواب دیا بیدی صاحب بہت سے آدمی دروازے کے سامنے بیٹھے ہیں، خبردار باہر نکلے مت، بہت سی شریف قسم کی خواتین بھی موجود ہیں۔

وہ بولے "یہ بے ہودگی ہے ہودگی کچھ نہیں نہ مذاق ہے، یہ حقیقت ہے اور آپ نے جو قیامتیں اٹھا رکھی ہیں، ان کا شافی علاج۔"

بیدی صاحب بولے "کیا تم میرا کیریکٹر خراب کرتے آئے ہو؟"

خواجہ احمد عباس بولے "آپ کو اپنے اصول بدلنے ہوں گے۔ کیونکہ زمانہ بڑا نازک ہے آپ کو دونوں ہاتھوں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔"

بیدی صاحب بولے "تم نے اپنے سو روپے اس دن بھنگیوں میں کیوں بانٹ دیئے تھے؟"

خواجہ احمد عباس بولے "میں تو کمیونسٹ ہوں، تم کمیونسٹ تھوڑی ہو؟"

بیدی صاحب بولے "خیر اب تم لوگ مذاق چھوڑو، میرے کپڑے اندر پھینکو

ورنہ ساری کمیونزم نکال دوں گا۔

میں نے جواب دیا: "بیدی صاحب مذاق کرنے والوں کے چہرے پر پھٹکار۔ پانچ منٹ کے اندر اندر گھر کے تمام مفت خوروں، چوروں، ڈاکوؤں کو دفع کیجئے، لچے، لفنگوں کی نشستیں بند کیجئے اور آئندہ کے لئے وعدہ کیجئے کہ اب اپنا پیسہ گھر والوں پر صرف کریں گے، تو کپڑے ملیں گے ورنہ نہیں۔ ہم سب اپنے اصولوں کے بڑے پکے ہیں، اور ہم سب اس وقت ایک طے شدہ سازش کے تحت یہاں جمع ہوئے ہیں، ایک غنڈۂ عظیم کی سرکردگی میں۔"

بیدی صاحب بولے: "تم سب جہنم میں جاؤ مجھے تم لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں نہ تمہارے شوروں کی ضرورت ہے، میں باہر آکر تم سب کی طبیعت ٹھیک کردوں گا۔"

عصمت پہلی مرتبہ بولیں: "بیدی صاحب خدا کے لئے کہیں باہر مت آجائیے، میرے ساتھ اس وقت اور بھی بہت سی خواتین بیٹھی ہیں اور سنئے یہ بچے سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ کو اس وقت تک باہر نہیں نکالا جائے گا، جب تک آپ ایک شریف آدمی نہ بن جائیں۔"

بیدی صاحب بولے: "میں یہاں بڑے مزے میں ہوں دوست نما دشمنو!"
عصمت نے جواب دیا: "بڑے مزے میں ہیں تو مزے میں رہیے ہم آپ کے مزوں میں خلل نہیں ڈالیں گے۔"

منت خوشامد کرنے کے بعد جب بیدی صاحب کا بس نہ چلا تو مغلظات پر اتر آئے زور زور سے چلانے لگے .... عصمت صاحبہ کے سوا اتنی سب

کمینو! ذلیلو، مردودو! پاجیو! شرم نہیں آتی؛ میرے کپڑے اندر پھینک دو یا یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ میں تم سب پر مداخلت بے جا کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔

جب ہم پر ان گالیوں اور دھمکیوں کا بھی اثر نہ ہوا تو انہوں نے ہمیں وہ وہ گالیاں دینی شروع کر دیں کہ عصمت کان میں انگلیاں ٹھونس کر وہاں سے بھاگ گئیں۔

اس طرح شام کے پانچ بج گئے۔ پانچ بجے کے قریب میں نے چائے کی ایک پیالی اور دو بسکٹ اندر غسل خانے میں بڑھا دیئے۔ بیدی صاحب نے دونوں چیزیں مالِ غنیمت سمجھ کر جھپٹ لیں۔

رات کے گیارہ بجے تک نہ بیدی صاحب ہارے نہ ہم۔ اتنے میں نوکر ہوٹل سے ہم سب کا کھانا لے آیا۔ ایک ٹرے ہم نے بیدی صاحب کو پکڑا دی۔

بیدی صاحب کھانا کھاتے جاتے تھے، اور ہمیں بددعائیں دیتے جاتے تھے جیسے مربعے کے ساتھ وہ تیکھی چٹنی استعمال کر رہے ہوں۔

اتنے میں مسز بیدی بھی گھر آ گئیں۔ جب وہ اس معاملے میں مداخلت کرنے آئیں تو ہم سب نے ان سے جھگڑا کر لیا کہ اگر آپ نے اس معاملے میں ذرا بھی دخل دیا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چند گھنٹوں، چند دنوں یا چند ہفتوں کی تکلیف سے اگر گھر کے سب لوگوں کی جہنمی زندگی جنت بن جائے تو کیا حرج ہے۔

تمام رات ہم سب باتھ روم کے سامنے دریوں پر چوکنے ہو کر بیٹھے رہے اور رات بھر باتھ روم میں سے بیدی صاحب کی گالیوں کی صدائیں آتی رہیں

اور مسز بیدی ہم سے لڑتی رہیں کہ بُری بات ہے ،

دوسرے دن صبح ہم نے انہیں ناشتہ بھی پہنچایا اور دوپہر اور رات کا کھانا بھی ، کھانا کھا کر وہ برتن مارے غصے کے کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر سڑک پر پھینک دیتے تھے ۔ اور ساتھ ہی پچیس ہزار گالیاں فضا میں گونج جاتی تھی ،

اس طرح تین دن گزر گئے ، ان تین دنوں میں ہم پر مسز بیدی پر اور بیدی صاحب پر جو بیتی ، کچھ نہ پوچھئے یہاں تک کہ مسز بیدی ہم سے ناراض ہو گئیں ۔ نریندر مارے شرم کے گھر سے بھاگ گیا ، ہم ڈھیٹوں کی طرح ڈٹے رہے ۔ چوتھے دن بیدی صاحب کو ہار ماننی پڑی اور ہم نے ان سے مندرجہ ذیل حلفیہ وعدے لے لئے جو انہوں نے باتھ روم میں بیٹھے بیٹھے ہزار دس ہزار گالیوں کے ساتھ دہرائے ،

۱ :۔ میں مسمی راجندر سنگھ بیدی آئندہ بڑی بڑی نیکیاں نہیں کروں گا ۔۔۔ تم کمینے ، پاجی ، رذیل ہو !

۲ :۔ بیکار اور لچے لفنگوں میں اپنی دولت تقسیم نہیں کروں گا ۔۔۔۔۔ جیسے تم لوگ ، لعنت ہو تم سب پر !

۳ :۔ تمام مہمانوں کو گھر سے نکال دوں گا ، پنشنیں بند کر دوں گا ۔۔۔۔۔۔ خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے ۔۔ !

۴ :۔ جب تک زندہ رہوں گا نیک چلن رہوں گا ، نیک چلنی سے مراد وہ چلن ہیں جنہیں کرشن چندر ، خواجہ احمد عباس مہندر ناتھ اور راجہ مہدی علی خاں

جیسے غنڈے اچھے چلن قرار دیں..... بڑے آئے رہنمایانِ قوم !

۵ ۔ تم لوگوں کے مشورے اور تحقیقات کے بغیر کسی کو ایک پیسہ نہ دوں گا..... تمہاری طرح کمینہ بن جاؤں گا یہ پانچوں شرطیں منوانے کے بعد ہم نے بیدی کو کپڑے دے کر باتھ روم سے باہر نکالا جب وہ باہر نکلے تو مارے غصّے کے بپھرے ہوئے تھے، بھابی اور عصمت کو چھوڑ کر انہوں نے ہم سب کو ایک لٹھیا سے اتنا پیٹا کہ کسی کی ہڈی غائب ہوگئی اور کسی کی پسلی جب ہم نے شور مچایا تو بولے کہ میں نے یہ قسم تو نہیں کھائی تھی کہ تم لوگوں کی مرمت نہیں کروں گا، آئندہ سے میری تمہاری دوستی ختم خبردار جو کبھی میرے گھر میں قدم رکھا۔

میں نے جواب دیا: آپ ہم سے ناراض ہوں یا ناخوش یا بیزار ہم لوگوں نے تین راتیں جاگ کر اور اپنے کاموں کاجوں کا ہرج کر کے آپ کے گھر میں امن وخوشی کے چراغ جلا دیئے ہیں، ہمارا یہی مقصد تھا جو پورا ہوگیا۔

اس حادثے کے بعد نہ کبھی بیدی صاحب نے ہمیں اپنے گھر بلایا، نہ کبھی ہم ان کے گھر گئے۔

ایک مرتبہ وہ اپنی کار میں بیٹھے ایک بس اسٹاپ سے گزرے، خدا کے فضل و کرم سے اب کے کار میں صرف بیدی صاحب تھے، انھوں نے ہمیں ایک لمبے کیو میں دیکھ لیا اور بڑے زور سے کار بھگا کے لے گئے۔ میں نے کرشن چندر کو دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

خواجہ صاحب بولے: جو شخص اپنی گاڑی میں دس دس آدمیوں کو بٹھا کے اپنے آپ کو کیریئر پر بندھوا لیتا تھا، آج دوستوں کو دیکھ کر کیسا اڑنچھو

ہو گیا۔

مہندر ناتھ نے کہا۔ اب بیدی صحیح معنوں میں انسان بن گیا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ اب شاید اس کا مجنگی بھی بیکار ہو گیا ہو گا

ہم چاروں نے نعرہ لگایا۔ راجندر سنگھ بیدی زندہ باد! ہم لوگ زندہ باد سوائے بیدی صاحب کے مانگنے والے دوستو اور نہ مانگنے والے دشمنو! سن لو کہ بیدی صاحب پہلے سے بیدی صاحب نہیں رہے۔ اب کوئی صاحب ان کے یہاں جاکر اپنا وقت اور بس یا ٹیکسی کا کرایہ ضائع نہ کریں۔

٭

راجہ مہدی علیخاں

جوگیا

نہا دھو کر، نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے، جوگیا روز کی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور میں اپنے ہاں سے تھوڑا نیچے ہٹ کر دیکھنے لگا ایسے میں دروازہ کو ہاتھ لگا تو چوں کی ایک بے سُری آواز پیدا ہوئی، بڑے بھیا جو کہیں پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے، مڑ کر بولے۔

"کیا ہے جنگل ؟

"کچھ نہیں ہوتے بھیا"۔ میں نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا۔"گرمی بہت ہے"۔

اور پھر میں سامنے دیکھنے لگا..... ساری کے سلسلے میں آج جوگیا کون سا رنگ چنتی ہے!

میں جب جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا، رنگ میرے حواس پر چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالبادیوی کی وادی سنبیٹ اگیاری لین میں تھا، پارسیوں کی اگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پہ تھی، یہاں پر صرف مکان تھے، آمنے سامنے اور ایک

دوسرے سے بغل گیر ہورہے تھے۔ ان مکانوں کی ہم آغوشیاں کہیں تو ماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی ملائم ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ۔۔۔۔ سینہ بہ سینہ لب بہ لب غلیظ اور مقدس۔

سلمتے پانوگھر کی قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا۔۔۔۔۔ ابھی بجو کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنے ہی ہاتھ کاٹ لیے ہیں۔ ڈنکر بھائی نے احمد آباد سے گھی اور نیل کے دو پیپے منگوائے ہیں اور پنجابن سب کی نظریں بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک کر چلی ہے۔۔۔۔ جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب نظر آتا تھا ایسے ہی انہیں بھی ہمارا سب کچھ نظر آتا ہوگا۔

جوگیا کے گھر کا نام تو رنچھوڑ نواس تھا لیکن میں اسے پانوگھر کی قسم کا مکان اس لئے کہتا ہوں کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں جن میں سے ایک جوگیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی کہ جس سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی اس کی تعلیم بھی مکمل کرے۔

جوگیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا۔ لیکن بدن کے بھرے پرے اور گٹھے ہوتے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ جوگیا دال، رتگا اور ہفتے میں ایک آدھ بار کی سڑی کھنڈے سے اتنی تندرست ہوسکتی ہے۔ بہر حال ان لڑکیوں کا

کچھ مت کہیے، جو بھی کھاتی ہیں الم غلم اِن کے بدن کو لگتا ہے اور بعض وقت تو غلط حصّوں کو لگتا ہے۔۔۔۔ جنہیں میں تو صحیح کہتا ہوں کیونکہ عورت کے جسم میں پتلے پتلے، پیلے پیلے خطوط کی بہ نسبت مجھے گہرے گہرے اور بھرپور خطا اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔ جوگیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رُخ کی طرح چوڑا تھا جس میں قندیلوں جیسی آنکھیں، رات کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں، مورتی میں ناک اور ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹنکے ہوئے تھے، سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمائش کرتے تھے جنہیں کبھی وہ ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر چلتی رہتیں۔۔۔ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تارا منڈل تھا جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔۔۔ جوگیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی، کب اور کس وقت اور کیا کرنا ہے، یہ وہی جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا، گر بڑھتی تو صرف رنگ کی کیونکہ جوگیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گورا تھا جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی چیزیں اتنی متناسب نہ ہوتیں تو بس چھٹی ہو گئی تھی،

میں نہیں جانتا محبت کس چڑیا کا نام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر کوئی دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جوگیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی۔ جوگیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی،

عجیب سہیلی پنا تھا کیونکہ ہیما صرف سات سال کی تھی اور جوگیا اٹھارہ برس کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جوگیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے، کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے اس لیے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جوگیا سب کو سبق دے جاتی تھی، میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا۔ ایسے رکھ رکھاؤ کی باتوں کا قائل نہ تھا لیکن میری مجبوریاں تھیں، میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔۔۔۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا کہ اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے اور لڑکیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں بنا کسی التفات کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں، خاک لطف اٹھاتے ہیں؟ اتفاقاً محبوبہ کے بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہوگی۔۔۔۔ شاید ان کو کوئی ایسا لطف آتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور ادھر ادھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا ہوگا

یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جوگیا کے پنڈے کو لگ گیا ہوگا۔ ایک بار صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے جوگیا کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے۔۔۔۔ ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا۔ جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور

منہ میں ٹھنڈا دسنا پڑھتا رہتا تھا۔ وہ صرف وہ ہمارے سرورش کو سمجھتا تھا۔ اس
لئے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اسے ضرور صاحب جی کہتے اور پھر اس
راستے پر چل پڑتے جو دنیا کے لہو ولعب، میٹرو سینما کی طرف جاتا تھا جہاں پہنچ
کر جوگیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے اسکول کی طرف۔ راستے بھر ہم
غیر متعلق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی
تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور اس بات پر
کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارہ نہیں۔۔۔ ایک دن جہانگیر آرٹ گیلری
میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی، اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی
اس بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔۔۔ صرف میں اور جوگیا
پہنچے تھے، اور وہ بھی دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے، محسوس کرنے کے
لئے۔۔۔ پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں
گھور رہے تھے۔ 'جوہو میں ایک صبح' کے نام کی ایک بڑی سی تصویر تھی جس
میں اوپر کے حصے پر برش سے گہرے سرخ رنگ کو موٹے موٹے اور بھدے
طریقے سے تھوپا اور بگھارا گیا تھا۔ جس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا
کر دیا۔۔۔ اس تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا جس پر جوگیا کسی اندرونی
تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔۔۔ اس کی سانس قدرے تیز تھی۔۔۔۔ اور
میں جانتا تھا محبت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سینکڑوں فرسنگ ہوتا ہے
۔۔۔۔ اور آدمی چلنے سے پہلے ہی تھک جاتا ہے۔

آرٹسٹ روہانسا ہو کر باہر چلا گیا تھا۔۔۔ دیکھئے کوئی آتا مرتا ہے یا

نہیں ..... اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا،
جبھی ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھر دیا تھا،
اس دن میں نے جوگیا سے سب کہہ دینا چاہا ..... ہم دونوں ہی پیار کی
ہیرا پھیریوں سے تنگ آچکے تھے ..... چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا
ٹھٹھکا اور پھر اسٹول کے پاس، جوگیا کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا
تو بس اتنا "جوگیا! میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں؟"
"سامنے آکے سناؤ" جوگیا بولی۔
میں نے کہا "لطیفہ ہی ایسا ہے۔"
میری طرف دیکھے بغیر ہی اسے میرے حیص بیص کا اندازہ ہو رہا تھا اور
مجھے پیچھے سے اس کے کانوں کی لوؤں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی
آخر میں نے لطیفہ شروع کیا۔
"ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا"
"ہوں" جوگیا کے سنبھلتے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔
"وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا"
اس پر جوگیا نے تین چوتھائی میں میری طرف دیکھا "تم لطیفہ سنا رہے ہو؟"
"ہاں" میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا۔
اور جوگیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ..... منتظر ..... ایک ایسا انتظار جو
بہت ہی لمبا ہو گیا تھا ..... جس میں لمحات کے بشرارے کسی بارود سے چھوٹ
چھوٹ کر نکل رہے تھے، خلا میں پھٹ رہے تھے، اور آخر معدومیت کا

حصّہ ہوتے جا رہے تھے، جبھی جو ہو میں ایک صبح میں لال رنگ کے بیچ سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈولتی ہوئی کشتی پر پڑی اور میں نے کہا: "وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آگئی۔۔۔۔ آخر اس نے سوچا اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں۔ کیوں نہ میں اسے ایسا موقع دوں، شاید۔۔۔ چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلایا۔ لڑکا آیا بھی، گلدستہ بھی لایا جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا۔۔۔۔ یہ کتنا پیارا ہے، یہ اودے میں گلابی، گلابی میں سفید رنگ کے پھول۔۔۔۔ ان کے بدلے میں تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے۔"

"پھر"؟ جوگیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

پھر۔۔۔ لڑکی نے اپنا منہ تھوڑا آگے کر دیا۔ مگر۔۔۔۔ وہ لڑکا باہر جا رہا تھا دروازے کی طرف۔

"ہے بھگوان"، اور جوگیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "لڑکی بولی۔ کہاں جا رہے ہو لالی! جس پر لالی نے دروازے کے پاس مڑتے ہوئے کہا۔ اور پھول لینے۔

اس سے پہلے کہ جوگیا ہنستی اور اپنا انتظار ابدیت پر چھا جاتا، میں نے پیچھے سے اس کے دونوں بازو دبکڑ کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔۔۔۔ اب جوگیا بناوٹی غصّے سے مجھے ہلکے ہلکے تھپڑ لگا رہی تھی، اور اپنے ہونٹ پونچھ رہی تھی۔ وہ ہنس نہ سکتی تھی کیونکہ وہ ناراض تھی اور خوش تھی۔ محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایکا ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں

تے ہرا بھرا کر دیا تھا... اس دن اگر ہم جوشیلے سرخ رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا منہ نہ چوم سکتا تھا۔ اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بانزو والی تصویر خریدلی۔ جس کا نام تھا کوئی کسی کا نہیں اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیئے رو رہی تھی۔ سب رنگوں میں اداسی تھی اور وہ ایسے وقت میں اداسی کے رنگ خرید رہا تھا جب کہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے، جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی... جوگیا ایک عظیم تشفی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا، مکا دکھایا، مسکرائی اور دوڑ گئی۔

کچھ دیر یوں ہی ادھر ادھر رنگ اچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھیں... لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، پیلا، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں... کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔ ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریق میں نہیں آتا، اور جسے اجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوئے ہیں... میرا انگ انگ شکر کے احساس سے رندھا ہوا تھا... میں کس کا شکریہ ادا کر رہا تھا... اس ایک لمس سے جوگیا ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی تھی۔ میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی، کسی کے ساتھ سو بھی جاتی، جب بھی وہ میری تھی۔ ایسا چھن جس میں سچائی ہو، ولولہ ہو، بدنصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے۔

تو گویا میں اس دن دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساری جو گیا اپنی الماری
میں سے نکالتی ہے، اگر وہ مجھے میرے ہال کے دروازے کے پیچھے دیکھ
لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی۔ آج کون سی ساری پہنوں اور اس میں سارا
مزہ کرکرا ہو جاتا میں تو جاننا چاہتا تھا، صبح سویرے نہا دھو کر جب کوئی سندری
اپنی ساری کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے تو اس میں کون سی چیز ہے
جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے ... آج گلابی رنگ کی ساری پہننی چاہیے۔ ان
عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پُراسرار ہے اور پرپیچ۔ اتنا بھید، اتنا ہلیہ
کہ مرد اس کی تھاہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سنا ہے چاند نہ صرف عورتوں کے خون
بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ
ہی نہیں، روشنی ہی میں نہیں، وہ تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے۔
تبھی ..... تبھی ساری پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کس سورج سے پوچھ
لیتی ہے ... آج کون سی ساری پہنوں!

نہیں نہیں ..... اس کا اپنا رنگ ہے اپنا فیصلہ، ہر کسی کو کوئی مرد
تھوڑا ہی بتانے جاتا ہے۔ پھر رات کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے اس کا اپنا رنگ

اس دن واقعی بہت گرمی تھی۔ نیچے وادی شیٹ اگیاری لین میں آتے
جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا
کہ بھٹیارن دانے بھون رہی ہے جبھی کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ
باندھے آتا تو اوپر سے بالکل مکئی کا دانہ معلوم ہوتا جو بھٹی کی آنچ میں
پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔

یہاں گیان بھون سے۔ مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیتے وہ سب ساریاں تھیں جن میں سے ایک جوگیا اپنے لیے، میرے لیے، ساری دنیا کے لیے، چمنا رہی تھی۔ یوں ہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا، شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن میں نے تو کسی ارٹ کی سیمانی ٹوپل پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس دن واقعی میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چنا ہے۔ ایسی گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگر میں ہوتا تو جوگیا کو یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا جبھی میں نے سوچا۔۔۔۔ میں نے چھپنے کی بہت کوشش کی لیکن جوگیا نے اپنے سایہ میں بلا کر مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے۔

پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا دکھ۔ معلوم ہوتا تھا گیارہ تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں، اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا۔ "آج تم نے بڑا پیارا رنگ چنا ہے، جوگی۔۔۔۔"

"میں جانتی تھی تم اسے پسند کرو گے۔"

"تم کیسے جانتی تھی؟"

"ایسے ہی۔۔۔۔ کبھی کبھی تمہارا من میرے من میں آجاتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔۔۔ "آج تمہیں چھونے، ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"کیا جی چاہتا ہے؟"

اسی وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ آگئی جس کو نکلنے میں صدیاں لگیں، میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھینٹے اڑانے لگیں، جب تک ہم پرنس اسٹریٹ کا چوراہا پار کر کے میٹرو کے پاس آچکے تھے، جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ میں نے کہا: "آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں۔"

"روؤ؟ ... کیوں؟"

"شاستر کہتے ہیں آتمک پاپ رونے ہی سے دھل سکتے ہیں۔"

"کون سا پاپ ہے تمہاری آتما میں"

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھ سکتیں اور پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں، جوگیا نہ سمجھ سکی، اپنا ہی کوئی پیار اس کے من میں چلا آیا تھا۔ "جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟"

"کیا ... کیا ... کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے ..." اور اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی ساری کی طرف اشارہ کیا "تمہیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے آپ واپس آؤں نہ تمہیں آنے دوں۔" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے کبھی وہ آتی تھیں۔

میں کچھ دیر کے لیے وہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پر لے گئی ہیں جہاں سے وہ خود آتی ہیں اور نہ انہیں آنے دیتی ہیں۔ خدا بھی

ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ایک سرد آہ بھر کر چلا جاتا ہے ،
مڑ کے دیکھا تو جو گیا جا چکی تھی ،

امیر تو کہاں رہ گیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی سڑک کے ایک طرف یتیم اور لاوارث چھوڑ گئی تھی، جس کا احساس مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا، حدت سے پھٹتی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینہ پونچھتے ادھر ادھر گرمی کے ستائے ہوئے آ جا رہے تھے جبھی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے ، وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی ، لانبی اونچی ، ایب کٹے بال ، جو ہلکے نیلے رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی ،

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں دو ، تین ، چار ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں ،

یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا اس سے پہلے بھی ایک بار کرا غورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا ، فرق تھا تو صرف اتنا کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساری ، اسکرٹ بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ گیا تھا ۔ ۔ ۔ سویرے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھانٹتی بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کون سی بات ، کون سا ایسا جذبہ ہے جو انہیں بتا دیتا ہے ۔ ۔ ۔ آج مولسری پہننا چاہئے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اوب جاتی ہے ، پھر دوسرے دن اس کا ہاتھ اپنے آپ کسی

دوسرے رنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً سرسوں کا سا پیلا رنگ، چمپئی رنگ گل اناری، کاسنی، فیروزی،... لیکن... وہ کون سا لے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب کی سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایسا ایک پورا بازار، پورا سنسار ایک ہی رنگ سے بھر جاتا ہے۔ شاید یہ موسم کی بات ہے یا ویسے ہی چاند کی، بادل کی.... شاید کوئی مروجہ فیشن، کسی ایکٹریس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے؟... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ... بعض اوقات وہ زنگار رنگ کپڑے بھی پہنتی ہیں اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساریاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہیں آرہا تھا، سمجھ کا شمہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا، جب کہ میں اسکول پہنچا، ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آرہے تھے کچھ آکر کمپاؤنڈ میں گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے،

ان میں سوگیتی بھی تھی اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ نیلا تھا،

اگر ہنمیت، میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ ہنمیت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں وسنت تھا.... بہار جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی ہنسی اور تضحیک رہتی تھی جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے... سالے، چاہے وہاں کا زور لگا لے تو کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پر گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جاتے

کی نوبت آئی ہے ؟ بے بسی میں تشنجی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں. کیا تیرے بدن پر ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگنے ہیں؟ رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پہ جھپٹتے ہیں اور اپنا منہ تیری تصویر انعامی مقابلہ میں اول آئی ہو؟ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنوئیں میں دھکیل کر چل دیئے ہیں؟ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پہ چڑھایا گیا تھا، وہ تو تھا.. تیرے چہرے پہ سیاہیاں چھٹی ہیں اور تیرے خدوخال اتنے سخت، گھناؤنے اور طاقت ور ہوئے ہیں. جلتے میکسیکو کے میورلز!

آج پھر میں نے اسے بتایا شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا رنگ پہنے نکل آئی ہیں ہنمیت نے اپنے دانت دکھا دیئے اور حسب معمول میرا مذاق اڑانے لگا، وہ مجھے ساون کا اندھا سمجھتا تھا جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے، میں نے سوکینشی کی طرف اشارہ کیا جسے ہم ماڈل کہا کرتے ہیں، وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی، لیکن اس کے بدن کے خطوط بالکل ویسی لڑکیوں کے تھے، میں نے کہا، دیکھو آج یہ بھی ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے ہے.

ہنمیت نے مجھے کچھ نہ کہا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کیپاد تنڈ سے لاٹ پرے آیا جو پام کے پیڑوں سے پٹا پڑا تھا، وہاں ایک کنارے پر پہنچ کر وہ باڑ کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی، ایک راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا وکٹوریہ ٹرمینس اور ہارن

٥٠ روڈ کی طرف، وہ ثابت کرنا چاہتا تھا یہ سب میرا وہم ہے وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی، اگر عورتیں اپنے اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساری میں چھپا کر اوپر امبروں پر اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد نظر نہ آتے۔۔۔ لیکن۔۔۔ چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے کبھی کسی عورت سے انہیں۔۔۔ سروکار ہی نہ تھا۔۔۔ کوئی لانبا تھا اور کوئی ناٹا، کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور توندیلا۔ اور وہ سب بھاگ رہے تھے جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ جبھی ادھر سے جیسے لوہے کی بنی ہوئی گھاٹن گزری جس نے ہرے رنگ کا کاشٹا لگا رکھا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمنیت بولا: "پہچان اپنی ماں کو۔۔۔"

میں نے بیکار کی غداری کی۔" میں ان بیچاری غریب مزدور عورتوں کی بات نہیں کرتا۔"

"کن کی کرتے ہو؟"

"ان کی، جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔"

جبھی میری بدقسمتی سے ایک سیڈان، سامنے پارسی دارو والے کے ہاں رکی اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی، وہ اس جماعت کی نمائندہ تھی جن کے پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں اور رنگ آتنی الوا ع کے کہ وہ بوکھلا جاتی ہیں اس لیے جب وہ اپنے وارڈ روب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں، سندریوں کا وہ بے تار برقی کا پیغام نہیں آتا، ان کی حالت اس خریدار کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دکاندار انواع

د اقسام کا ڈھیر لگا دے اور اِن میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔ وہ عورت خوب لپی پتی ہوئی تھی اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساری پہن رکھی تھی، پچاس فٹ چوڑی سڑک کے اس پار سے مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلہ سا رنگ نہ چلے گا۔

اس عورت کا نوکر جو تھوڑی دیر پہلے پرمٹ کے کاغذ سنبھالتا ہوا اندر گیا تھا، ایک ٹوکری میں کچھ وسکی اور چند بیئر کی بوتلیں رکھے ہوئے باہر چلا آیا اور ڈگی کھول کر اس میں رکھنے لگا جب تک میں ... ہنمیت کے سامنے خفیف ہو چکا تھا۔ اپنی خفت کو چھپانے کیلئے میں نے کہا۔

یہ بیئر کی بوتلیں ... کم از کم اس کے مرد کو تو گرمی لگتی ہے۔

ایسے ہی میں ہنمیت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جب کہ سب عورتیں سرمئی ساریاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں، مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے لیکن جب ہنمیت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو وہ سب الگ الگ دکھائی دینے لگتے، آخر میں نے اسے اپنے دل کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا،

لیکن وہ چھوٹتا کیسے، ایک دن جو گیتے نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساری کا بیحد خوب صورت امتزاج پیدا کیا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی میچنگ کر رکھا تھا، فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان میں کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساری کالے رنگ کی تھی جس میں سنہرے کی ایک آدھ تار جھلملا رہی تھی،

کئی موسم بدلے، خزاں گئی تو بہار آئی۔۔۔ یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار
بمبئی میں آسکتی ہیں اور پھر اس بہار میں ایک کاہش سی پیدا ہونی شروع ہوئی
ایک چبھن، تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو حد درجہ گداز کر دیتی ہے
اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں، پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہو گیا اور اس
پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی، جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے بیچ ایک سی ہوا
پانی پر دوشالہ بن دیتی ہے، پھر سمندر میں اس قدر زمرد گھلا کہ نیلم ہو گیا اور اس
میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی
گیروں کے حوالے کرنے لگیں، پھر آسمان پر صورت و بجلی کا ٹکراؤ ہوا بادل گرجے
بجلی تڑپی اور یکایک چھاجوں پانی پڑنے لگا، اس عرصہ میں جوگیا نے کئی نیلے، پیلے
اودے، کالے، سردئی اور سرمئی، دھانی اور چمپئی رنگ بدلے اسے کتنی جلدی تھی
لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہو جانے کی مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت
مند لڑکی کے جب بچے پیدا ہوں گے، جڑواں ہوں گے بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں
میں انہیں کیسے سنبھالوں گا، اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپ اسٹک لگانے کی اجازت
بھی لے چکی تھی۔۔۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جا رہی تھی اور دوسری
طرف لپک لپک کر کھل رہی تھی، جوگیا نے لپ اسٹک استعمال کرنے کی اجازت لے
لی تھی اتنی ساریوں، اتنے رنگوں کے لئے اتنے لپ اسٹک کہاں سے لاتی، میں
نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ اسٹک خرید کر تحفے میں جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش
ہوئی۔۔۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اس کے ہاتھ میں دے

دی ہو۔۔۔ وہ بھول ہی گئی کہ وہ میرے ساتھ گر گام کے ٹرام ۔۔ پٹے پر کھڑی ہے
وہ مجھ سے لپٹ گئی ۔۔۔۔ اس کے فوڑا ہی بعد اس کی آنکھیں میلوں اندر دھنس گئیں اور نمی باہر جھلکنے لگی، میں سمجھ گیا جوگیا بے حد جذباتی لڑکی ہے، بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی، لیکن بات دوسری تھی، جس رنگ کی میں لپ اسٹک لایا تھا، اس سے میچ کرتی ہوئی ساری جوگیا کے پاس نہ تھی۔ اور نہ خریدنے کے لیے پیسے تھے، میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوبصورت سی ساری خرید کرا سے دے سکتا۔ میں نے تو لپ اسٹک کے پیسے بھی موٹے بھیا سے چرائے تھے اور یا بھابی کے ساتھ اس عشق میں بٹورے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے۔

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشہ ہوا ۔۔۔ جوگیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے پڑے ہوئے کچھ عقیق بیچ ڈالے اور میری لپ اسٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ایک ساری خرید لی۔۔۔ اس بات کا مجھے کہاں پتہ چلتا لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی، جوگیا کی سہیلی رہما! ۔۔۔ جوگیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساری پہنی اور جب ہم اگیاری پار، لاقانونیت کے جنگل میں ملے تو میں نے جو کہا! آج تم کیا لگ رہی ہو؟

"کیا لگتی ہوں"؟

"بیر بہوٹی ۔۔۔۔ جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے"۔

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی، میری طرف دیکھا اور بولی "جانتے ہو تم کون ہو"؟

"بیر..... اور میں بیر بہوٹی"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساری کے رنگ میں ذرا بھی فرق نہ رہا۔

اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔۔۔ اپنی آنکھوں کے اس جلوس کی تاب نہ لاکر میں نے پھر ہنمیت سے کہدیا۔ اب کے ہنمیت نے اکیلے نہیں تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہ عام پر میری بے عزتی کی.....

شاید مجھے اتنا ہی بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سوکیشی وہاں نہ آجاتی جو سفید نائیلون کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریبًا ننگی نظر آرہی تھی ... وہ روز بروز سچ مچ کا ماڈل ہوتی جا رہی تھی،

جوگیا کی بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی، اس کا مجھے روح کی گہرائیوں تک سے اندازہ تھا لیکن میں کچھ نہ کر سکتا تھا... سوائے اس کے کہ میں اسکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کر لوں اور یا تصویریں بنا کر ملا بار ہل اور وارڈن روڈ کے چھوٹے دقیقہ شناسوں کو اونے پونے میں بیچ دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے وقت چاہیے تھا جو میرے پاس تو بہت تھا۔ تھوڑا بہت جوگیا کے پاس بھی تھا لیکن اس کی ماں کے پاس نہ تھا۔ محنت اور مشقت کی وجہ سے جیسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا،

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابی اور موتے بھیا سے کہدوں لیکن مجھے اس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ بھیا، بانو گھر میں جوگیا کے پیار دلار لیتی ہوئی۔ ایکا ایکی اپنے گھر میں آدھمکی اور دھڑسے کہہ ڈالتی۔

کاکا! کیوں نہیں تم جوگیا سے بیاہ کر ڈالتے۔

اور میں ہمیشہ کہتا ۔۔ "دھت"

"یہ دھت" اگر میں ہی کہتا رہتا تو کوئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد ہیا کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا اور بھابی نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک دن تو بھابی نے اس معصوم کو ایسا طمانچہ مارا کہ وہ الٹ کر دہلیز پر جا رہی ۔۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دونوں گھروں کے بیچ میں کوئی بات ہوئی ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا، جوگیا اور بجو رکی ماں اور پنجابن نے مل کر بھابی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی کھائی۔ پانچو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں ان سے باتیں کر لینا ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا، ایک آدھ کو اشارہ سے سلام کرنا اور چوری چھپے ان سے ہم بستری کر لینا بھی ٹھیک تھا لیکن ان کے ساتھ رشتے ناطے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال ان کا زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں ۔۔۔۔ جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ لمبا چوڑا دے دلا نہ سکتی تھی، اس لئے ہمارے گھر میں جب کوئی لڑکی جوان ہوتی تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں ۔۔۔۔ تیار ہو گئی مرنے کو ۔۔۔۔ خیر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے بعد بھابی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں ۔۔۔۔ جوگیا کا باپ کون تھا؟ کوئی کہتی وہ مسلمان تھا، اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک بنگالی تھا جو بردشے

میں بڑے عرصے تک رہا تھا یہ بھی بیہودہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں منادر کے برہمن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہیں مانا جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی مگر لوگ جوگیا کی ماں، ایک بیاہتا عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلے نہ پڑنے دیا اور وہ بمبئی چلی گئی، کچھ بھی تھا، اس میں جوگیا کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور باپ کی شفقت کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔۔۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے اور جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار تھا لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔۔۔ اب وہ چاہتی تھی جلدی سے جلدی جوگیا کا ہاتھ کسی واجبی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں دے دیا۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن سے وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی، اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے مجھ سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کپڑوں میں تیل چھڑک کر جل مرے گی۔ جوگیا اب کالج نہ جاتی تھی اور پانچ گھر کے جوگیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے لئے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی، سرِ شام ہی سے اندھیرے میں چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سمٹنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منہ رکھے تیزی سے میرا خون چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے

ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑتے جا رہے ہیں۔ ان شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا۔ ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے حبس اور جانکاہی کا رنگ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آئی ہیں وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف ماں کی چھاتیاں اور محبوبہ کی چھاتیاں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی اور جوگیا میری نہ ہو سکتی تھی۔

افوہ ..... ! اتنی گھٹن، اتنی اداسی .... اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے .... میلا میلا، چھدرا چھدرا، جیسے منہ میں ریت بے شمار ذرے اور پھر اس میں ایک عفونت ہوتی ہے جس سے متلی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے، جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اٹھا تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی تو میں اسے لیکر کہیں نکل جاتا۔ ... تبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بدھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لیکر اپنے پیٹ میں ڈال لیتے اور پھر بیٹھ کر "ادم منے پدمے" کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

میں واقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا، لیکن سامنے بانو گھر میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں نہیں سوتی اس کے بال بے حد روکھے تھے اور

یونہی ادھر ادھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے، اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبو دی، کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی،

میں اسکول کی طرف جا رہا تھا، راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے، انہیں کس نے بتایا تھا؟ ۔۔۔ وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انہیں کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھی، اور منہ میں بھجن تھے جو نہ کسی کو دکھائی دے رہے تھے اور نہ سنائی دے رہے تھے، وہ بھکشونی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں اور انھیں کھٹکھٹا رہی تھیں ۔۔۔ اس بھرے شہر بمبئی میں کوئی انہیں بھکشا دینے کے لئے باہر نہ آ رہا تھا،

اسکول پہنچا تو ہیمنت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی، بولا شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے۔

میں اس بے حس آدمی کو جواب نہ دینا چاہتا تھا، لیکن اپنے آپ ہی میرے منہ سے نکل گیا ۔۔۔! آج سب جوگنیں بن گئی ہیں، سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جوگیا پہن لیا ہے،

اس دن میں اسے اور سوکیشی کو گل مہر کے نیچے سے پام کے پیڑوں میں سے گھسیٹتا ہوا باڑ کے پاس لے گیا، سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے ساکت تھے، ان سب نے بیراگ پا لیا تھا، اور جوگیا کھتیاں سے بلا ارادہ بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں کوئی عورت نہیں جسے ان کو جواب دینا ہے،

میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا، وہ جوگیا کپڑے پہنے ہاتھ میں کمنڈل لیے جا رہی تھی، ہنمیت کھلکھلا کے ہنسا، ساتھ سوکیشی بھی ہنسی جس نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کو لیے، اس کی رانیں تک دکھائی دے رہی تھیں، وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی،

جب ہنمیت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا: تو بالکل پاگل ہو گیا ہے، جنگل کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟ اس عورت نے تو ایک اودی ساری پہن رکھی ہے اور وہ کمنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے، ایک خوبصورت پرس ہے" سوکیشی نے بھی ہنمیت کی تائید کی۔

میں تو اس بانجھ سڑک پر کھڑا سامنے دیکھتا رہا۔ جبھی ایک بس رکی اور اس بس سے ایک لڑکی اتری،۔۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے اپنے آپ کہا،۔۔" وہ جوگن ہے، جوگیا کپڑے پہنے ہوئے، میں کیا اندھا ہوں؟"

لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لیے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی۔۔۔ ہنمیت۔۔۔

لیکن ہنمیت اور سوکیشی ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے اندر جا چکے تھے، ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے، وہ مجھے ایسے ہی بے یار و مددگار اس صحرا کے کنارے چھوڑ گئے تھے، جیسے کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں،۔۔۔ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے،

اور وہ لڑکی اس طرف آ رہی تھی... اب تو مجھے پورے ستہ سار پھیلے ہوئے اس رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین، اور ایمان کی بلند آواز کے ساتھ منیمیت اور سرکیشی کو پکارتا، وہ لڑکی میرے قریب آچکی تھی میں نے ایک آواز سنی .... بیز

اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، کیونکہ وہ خود جوگیا تھی جسے میں نے اس صبح اپنے گیان بھون سے بانپو گھر کے گلے دروازے میں سے، سب ساریوں میں سے جوگیا رنگ کی ساری کا انتخاب کرتے دیکھا تھا.... ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور عجیب تر بے بسی کے عالم میں رک گیا جوگیا بولی "میں کل بڑودے جا رہی ہوں"

"کیوں جوگیا، بڑودے میں کیا ہے"

"میری ننھیال.... وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے، پرسوں ...."

"اور...."

"میں تم سے ملنے آئی تھی۔"

"تو لو... میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل صاحب اور کچھ دوسرے لوگ آ جا رہے تھے جب کہ جوگیا نے اچک کر اتنے زور سے میرا منہ چوم لیا کہ میں لڑکھڑایا اور لڑکھڑا کر رہ گیا... وہ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اس کا

بوسہ کتنا مرتعش تھا کتنی مقدس وحشت اور شہوت تھی اس میں اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو ہمیں وہ دکھائی نہ دیئے ۔

" وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے" جاتے ہوئے جوگیا نے کہا ۔

" میرے جانے کے بعد تم روئے تو تمہیں ماروں گی ۔" وہاں اور ساتھ ہی اس نے مجھے مسکرا دکھایا ۔۔۔ اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی ۔

سویرے گیان بھون اور بانپو گھر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی جس پر بازار کا بوجھ اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور کچھ ٹرنک رکھ رہے تھے اور کچھ یوں ہی ادھر ادھر کا سامان ۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے بانپو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے لیکن سامنے گیان بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا ، موٹے بھیا اور بھابی تو کیا آتے معصوم ہیما کو بھی انھوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آ رہی تھی ۔۔۔

بجوری کی ماں اور پنجابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی ۔ تھوڑا سانس درست کیا اور سب کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی ۔ اچھا بہنو ! ہم چلتے بھلے ، تم بستے بھلے ،

اور پھر آئی ۔۔۔ جوگیا ،

جوگیا نے ہلکے ، گلابی رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی اور گلاب ہی کا پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا ۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر

آنکلا میں تے عادتاً کہا صاحب جی ! صاحب جی پارسی پردمت نے کہا ادر پھر مجھے اور جوگیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا... آشیر واد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں زند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جوگیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

جب، میں نے بھی مسکرا دیا -!

کندن

بہت ہی مرا مرا سا دن تھا جب کہ نومبر کی وہ ٹھٹھرتی ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی ملبے دھڑا دھڑ ایک دوسرے پہ ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلتا تھا۔

کندن ایک احتساب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی ایک ہاتھ سے اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے کتابیں جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پر ڈھیلی ہو رہی تھیں۔ یہ کتابیں کندن نے اسی شام فادر ولیم اسکول کی لائبریری سے نکلوائی تھیں، جہاں وہ وائس پرنسپل تھی۔ قاعدے سے کندن کو گولی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہیے تھا مگر پھاٹک کے آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سرجو کے پاس رک گئی۔

سرجو یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا۔

یہ پیڑ کندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا جب کہ وہ نئی نئی وسکونسن یونیورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب یہاں کیتھولک چیپلن فادر منسٹر رہا کرتا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کر کے امریکہ چلا گیا اور کندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بلا لیا۔ سائیکل کو جنگلے کے سہارے رکھ کر کندن سرجو کے پاس آئی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں پتے اب تک

اندھیرے کا رنگ لے چکے تھے۔ البتہ نیچے کی سفید ملائم اور برجی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے ہی والی تھی کہ ایک طرف برآمدے میں اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا۔ اسی دم جھک کر کندن نے پیڑ کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھا لیے اور ہاتھ میں مسل کر انہیں سونگھتے اور لانبے لانبے سانس لینے لگی جیسے اسے زکام ہو اور یوکلپٹس کی بو تنفس اور اس کے رگوں اور ریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے کندن تھوڑا کھسیائی ... "میں تو سرّو کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں ماں۔" اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے چہرے میں سے پسینے کے باریک قطرے رس رہے تھے جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ دوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی ... "پودے دن کو نہیں رات کو بڑھتے ہیں کندنا۔"

"کیوں رات کو کیوں؟"

"اتپتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔"

اور پھر ماں چپ ہو گئی۔ کندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ماں ایک پیڑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی بیمار سی محبت کو دیکھ کر اکثر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ سائیکل کو بنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے کے پاس پہنچی ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا ... "پھر کیا نا دہی جلجگن، لکھی نے۔"

لکھی کندن کی کرسچن نوکرانی تھی۔ کندن نے وہیں رکتے ہوئے کہا "کیا مطلب؟" اور پھر جیسے اپنے آپ ہی سمجھ گئی ... "شروع ہو گیا؟"

"ہاں"

"کب"؟

"جب پڑوس کے مالی سے تمہیں ٹالی فون کرایا تھا"

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے فرش ہی پر بیٹھ گئی حالانکہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاتیوں کے لیے رکھی ہوئی آدھی درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں... یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مرنے والا ہو یا مر چکا ہو۔

ادھر لکھی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی۔ ادھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی اس کی آخری گالی تھی... "چھنال..." جبھی لکھی کی چیخ سنائی دی وہاں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے لگیں، جیسے لکھی انہیں سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو... شاید زچہ کے درد میں مبتلا عورت کہیں بھی ہو، دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ماں"۔

"سن رہی ہوں" ماں نے اپنے بوڑھے چرمرچوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا اور گرتے گرتے بچی ... "مجھے بھی کان دیئے ہیں پرماتما نے" وہ بولی ... اور سچ مچ ہی اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اٹھا دیئے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں چلا اٹھی "مرتی ہے تو مر جائے کیوں نہیں دن کے وقت بیاتی رانڈ! ... پار سال بھی ایسے ہی کیا تھا..."

ماں بولت بیٹر بھی نہ رہ سکتی تھی، کیسے خونخون ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر اور کپڑے جو نوچندی میں بنوائے تھے۔ تم نے پیسے بھیجے تھے۔۔۔۔ میں اس کے باپ کی دائی ہوں"! پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی آئے پیچھے جو تھوڑے تھے پیدبستان دے رہی تھی مسلسل ہوگئی کندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آثار پیدا ہو گیا اور طنابیں سی نیچے کھنچنے لگیں سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی، "تو سمجھتی کیوں نہیں ماں! ۔۔۔ وہ غریب ہے، پیسے والے سودا رو کر سکتے ہیں۔

اور کندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چلی۔ ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔ "کندنا" یا اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی ۔۔۔ "یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے"؟

ماں کسی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اہمیت کو جتانا بھی جاتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بکے جا رہی تھی۔ صرف ایک ہی لفظ کندن کے کان میں پڑا "چھنار" کہیں سے کوئی چمگادڑ اڑا اور ڈرائنگ روم کے اندر پرا لولا کی شکل پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اڑ گیا، جس میں سے ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے جھینگے قطار در قطار اندر آ رہے تھے۔ اور سو واٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ جب وہ گرتے تو پتہ بھی نہ چلتا، صرف نیچے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا جیسے زمین اوپر کی طرف اٹھ رہی ہو اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہو۔ کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اونچ نیچ سب

نظر آتا ہے مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ صرف اس کے عادی ہو جانے پر سیدیتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے سائے دکھائی دیتے ہیں جو اس یکسانیت میں اور بھی تائید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں۔ آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لئے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔

کندن واپس آکر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے موت کے بازو اوپر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا۔۔۔ کندن انتظار کرنے لگی۔

پہلے تو انتظار ٹک ٹک کرتا رہا پھر وہاں کے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح ٹن ٹن بجنے لگا چیخیں تھم چکی تھیں، شاید ماں کے پہنچ جانے سے کمی کو حوصلہ ہو گیا تھا، شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا نہیں بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا، شاید ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے۔۔۔ کندن کمی کی کھولی تک جا پہنچی لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو۔ پھر کمی کے ہنکنے کی آواز جیسے اس نے افیون کھائی ہو اور اصل کی تائید اور نقل کی تردید کر رہی ہو۔ کندن نے اپنے بدن میں سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مڑ آئی۔۔۔ راستے میں سرجو کی طرف دیکھا تو اسے ایک بچہ دکھائی دیا جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

تھوڑے حواس بجا ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں الٹنے پلٹنے لگی۔ ان پر کھڑکی میں آنے والے بے شمار ٹڈے بکھرے پڑے تھے۔ جس

کے پر پھیلے ہوئے تھے ، اور بدن مردہ ۔ کندن نے اوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا، مرد عورتوں کے بغیر "۔ اس نے کتاب کھولی ، پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی " عورتیں مرد کے بغیر ..."

فادر ولیم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کندن ایم اے ٹی ڈپ کے بنگلے میں تین عورتیں تھیں اور تینوں مردوں کے بغیر ... پہلی ماں ... سبھاشنی جو اب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور بے شمار ملبے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے اس کا نام آج کل لڑکیوں کا سا تھا، لیکن اب تک اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھیں نئے نام پرانے ہو چکے تھے ، اور نئی طرز کے وضع نہ ہوئے تھے اور لوگ مجبور ہو کر پرانے ناموں پر لوٹ آئے تھے ، جیسے ۔ کندن ... جو نام تو بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا پچیس چھبیس برس کا ... خوبصورت اور دمکتا ہوا ... سبھاشنی بدھوا تھی اور کندن یتیم ... اس نے تو باپ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی اور زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہی تھی ۔ ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق کندن کا باپ چل بسا تھا۔ اس صدی کے شروع میں جب پلیگ پڑی تھی اس نے موت میں سچ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا۔ عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی ۔ اس لیے جب مشن میں فادر مائیکل آسمانی باپ کی باتیں کرتا تو کندن ہمیشہ سوچنے لگتی ... وہ تو مر چکا ہے کسی زمینی پلیگ میں ... اور جب اسے کہا جاتا کہ آسمانی باپ لافانی ہے وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا ، تو وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جانا چاہیے خواہ وہ کیتھولک چیپلن ہی کیوں نہ ہو ... حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک

پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے۔

کئی بار کندن نے چچا، تایا، دادا اور ددھیال کے بارے میں پوچھا لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔ "سب مر کھپ گئے" دوسری پلنگ میں تیسری پلنگ کب آنے والی تھی) پھر یکایک متجسس سی نگاہیں کندن پر پھینکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی۔ "تو کیوں پوچھتی ہے؟"

"ایسے ہی" کندن جواب دیتی اور پھر کہہ اٹھتی۔ "ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے"

بھاشنی نے اپنا رنڈاپا اپنے چچیرے بھائی اموک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا جو امرتسر میں لاہور اور تبت سے آتے ہوئے کھڈ کا بیوپار کرتا تھا۔ کھڈ جو مرتے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی ہر دوڑا دیتی ہے، وہ مرتا ہر دم ہے، لیکن اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے۔ سبھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے تھے اور اس کے عوض روٹی کے روکھے سوکھے ٹکڑے پلے تھے۔ اسی لئے کندن کے لئے اس کی لوریاں بھجن ہو گئی تھیں۔۔۔ روکھا سوکھا رام کا ٹکڑا میٹھا کیا اور سلونا کیا۔۔۔ وہ بھابی کے پھٹے پرانے پہنتی تھی تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی کیونکہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا حالانکہ بھابی کا خرچ کی وجہ سے چاند کی طرح گھٹتا جا رہا تھا۔۔۔ بھابی کے کپڑوں میں سبھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے فرش پہ سوتی تھی اور ایک رہبانیت سی اس کے جذبات پہ چھائی رہتی تھی، جس میں اداسی بھری ایک تسلی تھی اسے اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ

چارپائی پہ سوتے ہے عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لحاف وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے۔ بھلا سردی کے موسم میں ان کی ضرورت بھی کیا تھی۔ پھر سہاشنی سوتی ہی کہاں تھی جاگتی بھی کہاں تھی۔ وہ تو خواب اور بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور بھجن اس کا سہارا ہوتے۔

جب نینن سے نیند گنوائی تکیہ لیف بچھونا کیا!
آخر سمجھ بوجھ کچھ سوچ پیارے، پیار کیا تو رونا کیا

بھابی کی گالیوں کو سہاشنی نے گھی کی نالیں سمجھا اور مار پیٹ، دھکوں کو پھولوں کی چھڑیاں یوں کندن کو پڑھایا۔ باقی وہ وظیفوں اور سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکہ جا پہنچی وہ خوبصورت تو تھی ہی اس پر تعلیم نے اس کے حسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں بیسوں شک تھے اور دوسرے ایک عجیب سے ارتفاع میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھینچ آئی تھیں معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہوگا۔۔۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتی رہتی تھی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔۔۔۔ باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔۔ اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی، مگر کھڈ نے اس کی زندگی بچا لی تاکہ وہ بڑی ہو کر یوکلپٹس کا پیڑ ہو سکے، یہ سب ایک طرح سے اچھا ہوا اور نہ کندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی۔

تیسری عورت لکھی تھی، تئیس ایک برس کی تھی اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست، اس کا اصلی نام لکھشمی رام داس تھا اور اس کے شوہر کا نام ساجھو نگر کیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کا نام کچھ یوں چڑھا کہ پھر نہ ہٹا لکھی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اس کے باپ کا نام تھا یا کسی پہلے شوہر کا کبھی وہ اسے شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا اور پھر ایک ابتری کے عالم میں:
میرے باپ کا بھی وہ نام تھا جو میرے مردے کا"

لکھی کا یہ تیسرا مرد۔۔۔ سدھو وہاں سے اکاون باون میل دور کسی کلاری میں کام کرتا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا جب اس کے کپڑے کوئلے اور اس کے وصول سے اٹے ہوئے اور چہرے پر سیاہیاں کھنڈ ہوتی، کچھ تو کوئلے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا۔ ان باتوں کے کارن وہ آپ ہی اپنا ہمزاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت بدصورت معلوم ہوتا اور جب آتا تو اس سے بھی زیادہ بدصورت۔

سدھو کا بھوت، بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سہاشنی اور بیٹی کندن پنجے جھاڑ کر لکھی کے پیچھے پڑ جاتیں۔

"کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھی ہے؟"

"...جب وہ تیری ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچوں کی...؟"

"سب مرد ایک ہی رسی سے پھانسی دیئے جانے کے قابل ہیں..."

"مرد... لکھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی... کبھی سب غلط اور کبھی صحیح معلوم ہونے لگتا... ہاں، ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے سب مرد اسی

قابل ہیں کہ ... میں ایک اور کر لوں گی، مگر نہیں ... وہ بھی تو ... پھر وہ غصے
میں بھپر جاتی اور اپنا ہاتھ جیتی کی طرف لے جاتی۔ اس کے بعد سدھو کا سر اد اس
کی طرف آتا ... نم آنکھیں، ہاتھ جوڑے ہوئے اور مکھی کا ہاتھ جوتی کی طرف
جانے لگتا۔ جب تک سدھو کا ہاتھ مکھی کے بدن پر جا پڑتا اور مکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ
جاتی۔ آنکھیں چڑھنے بند ہوتے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی ... اسے
جبھی پتہ چلتا جب اس کے پیٹ میں کیڑا سینگنے لگتا۔ کرسچن ہونے کے ناطے مکھی
میں صبر تھا اور شکر بھی ... لیکن کندن نہ کرسچین تھی نہ مسلمان اور نہ ہندو ...
وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو سوچتی۔ کیا بکواس ہے، بچہ ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا
ہے ایک دن تو آئے گا جب چاند زحل اور مشتری تک پہنچنے والی عورت کی سوچ
بیچارہ کے افلاک پر پہنچیں گے، اور مرد کے ہاں بھی بچہ پیدا ہونے کا سامان کریں
گے، آخر سلسلہ تقلیب ہی کا ہے نا ... مگر ایسے میں داڑھی اگ آئے گی ...
اچھی لگتی ہے ...

ماں گرتی پڑتی چلی آئی ... اس کے کالے بھورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے
ہوئے تھے، کچھ منہ پہ کچھ ڈھلکے ڈھلکے شانوں پر۔ اس نے کسی قدر جلدی سے اپنے
ہاتھ پیر خون سے صاف کیے تھے۔ اس پہ بھی بانات کی قمیص پہ ایک چھیچھڑا لگا ہوا
تھا جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی، وہ گالیاں دے رہی تھی، تیز تیز اور
بے ربط ... اس کی آخری گالی تھی ... "ایک لڑکی اور چلی آئی ..."

کندن چونک کر اٹھی، بچہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کندن کا تھا
جب وہ مکھی کے کوارٹر کی طرف لپکی تو ماں کہہ رہی تھی ... ایک لائسن (لائسنس)

سے لو، کندنا ! ۔۔۔۔ اب کے وہ حرامی آیا تو میں اسے گولی مار دوں گی ۔"
ماں سبھاشنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد رونے بیٹھ جاتی ہے ۔۔۔۔
سرجو لہراتا رہا۔ ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کندن اس کے پاس رکتا اور اس کی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی، رو رو، اور ماں سبھاشنی دیکھتی، پکارتی رہتی ۔ کندنا ! اب آ بھی جا ۔"
سرجو اب بیس پچیس، فٹ لمبا ہو گیا تھا، کہیں سولہ سترہ فٹ اوپر جا کر تو اس کے تنے پھوٹتے تھے، اور پتے ہتھیلیوں کی طرح ٹھونگا لٹکے رہتے جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سائے کی ضرورت ہوتی تو سرجو بیکار ثابت ہوتا ۔۔۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھاؤں یوں ہی بدن میں کپکپی پیدا کرتی تب یہ بھی لالبنے اور گھنیرے سائے پیدا کرنے لگتا اور کبھی کی تینوں، چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فراک تھامے، ییچھے سے ننگی، پیڑ کے نیچے چلی آتیں ۔۔۔ اس کی آخری بیٹی ریوڑی بھی اپنا گول مٹول اور چپٹی دار چہرہ لیے پیڑ کے نیچے سے ریت کے ملبے اکھٹے کرتے لگتی ۔

کندن نے ماں کے کہنے پر بندوق کا لائسنس تو نہ لیا تھا البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے ۔ بندوق تو رات کے وقت بیکار بھی ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتا ۔ اسلیے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا جس کا منہ خوفناک تھا ۔ اور جبڑے کالے ، جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکتی رہتی تھی ، چیگوار بہت

موڈی کتا تھا رسدھو کو بنگلے میں آنے دینا تو کجا، کندن کو بھی اندر آنے کے لیے اس سے اجازت لینی پڑتی تھی ،

بچیوں سے جنگوار البتہ مانوس ہو چکا تھا کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں ۔

ایک دن مکھی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا، اس کے پیٹ میں بچہ ہے ... وہ کیسے ہوا ؛ مکھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی، اس نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی۔ ماں سجاتشنی اور کندن جانتی تھیں کہ ریوڑی کے بعد سدھو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ مکھی نے چوری چھپے کوئی اور کر لیا ہو مگر مکھی انکار کرتی تھی ، وہ یہ بات بھی سچ کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا... نہیں دیکھا تو پھر سب کیسے ہوا ؟

بنگلے میں کہرام مچ گیا ... مکھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں بیٹی آپس میں لڑنے لگیں ۔ ماں اس کتیا کو باہر پھنکوا دینا چاہتی تھی ، مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی... اتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے ! ماں نے خود اپنے بھائی امو تک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی ۔ کندن نے بہت سمجھایا ۔ بھیا یا پیروں پڑی ۔ لیکن جب ماں باپ کی ہمسائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا ... " اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ میں مکھی کو نہ نکالوں گی ۔ " اس پہ ماں خوب دھاڑیں مار کر رو دی ۔ یہ بیٹی میرے ... ماں کا جانا سہ سکتی ہے لیکن مکھی کا نہیں ۔ مکھی اس کی کیا ہوتی ہے ؟ جبھی ماں کو بھابی کے غصے یاد آئے اور

اُس نے بیٹی کے پیروں پہ سر رکھ کر سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی۔۔

لیکن پھر کبھی سے وہی پوچھ گچھ شروع ۔۔۔" سچ بتا کہاں سے لائی ہے؟" کہیں سے نہیں۔ کبھی کہتی ۔۔" اگر میں نے گناہ کیا ہو تو خداوند یسوع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں۔"

"بیٹیوں کا کیا ہے" ماں کہتی " وہ تو ہر عورت چاہتی ہے۔"

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کا جواب دیتی۔ "ماں ۔"

ماں کندن کی طرف دیکھتی۔

"میں بھی تیری بیٹی ہوں" کندن آنکھوں میں شکایتیں لئے ہوئے ماں سے زیادہ اشبہ اور ادکت والی بات نہ کہہ سکتی اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی دیکھتی ہوں "کندنی" ۔۔۔ اور پھر "تو میری بات نہیں سمجھتی ۔۔ میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں میں بھی سوچتی ہوں کیوں اس سنسار میں چلی آئی، کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی؟"

اس بات کے مہینے ڈیڑھ کے بعد صبح کاذب کے قریب جگوار بہت غرایا بہت بھونکا۔۔ لیکن وہ لوہے کی موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ برآمدے کے جس ستون کے ساتھ اسے باندھ گیا تھا۔ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا مگر زنجیر نہ ٹوٹی اس کے یوں بے تحاشہ بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھوں میں لے کر ایک دو بار باہر جھانکا بھی مگر کچھ نہ دکھائی دینے پر خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے کہا ۔۔ "جگوار کو کیا ہوا، آج ۔۔؟"

"جانے ۔۔۔ بہت ہی بھونکا ہے۔"

"ادھر ہی بھونکتا ہے جس طرف سرجو ہے۔"

کندن نے ایک بار ادھر دیکھ لیا حالانکہ اندھی سی روشنی میں سرجو کی چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی۔ ہاں مامی! جانوروں کو وہ بھی سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔

اور کندن نے پٹے سے گھسیٹتے ہوئے جگیوار کو اندر ڈرائنگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں، اب سدھو آبھی جاتا تو کیا بگڑتا۔

لیکن پو پھٹے جب منہ میں برش لئے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس کندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے نیچے کوئی سفید سی چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹھکی اور پھر سنبھلتی ہوئی اس طرف بڑھتی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دعا پڑھ رہا ہے تبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"کون ہے"؟ کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رکتے ہوئے پوچھا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ تھوڑا سا ہلا ۔۔۔ کندن ایک قدم اور بڑھی اور اپنی نظروں کے گیرے کا ڈایافرام کھولتے ہوئے چلائی۔

"باپ ۔۔۔"

پھر وہ برش، تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر

باب کی طرف لپکی۔ باب ساکت و جامد کھڑا تھا۔۔۔ کندن اس سے لپٹ گئی۔۔۔ "باب۔۔۔ باب۔۔۔۔"

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے۔۔۔ وہ خاموش تھا۔۔۔ اس نے کہا بھی تو اتنا Keep away

کندن بھونچکی رہ کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں معمے لیے بابی فشر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن نکل آیا مشرق کے پرتو میں باب کی آنکھوں کے نمناک کونے دکھائی دے رہے تھے اور چہرے پر گناہوں کے احساس جو بہت سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتے۔

کندن نے پوچھ ہی لیا۔ "امریکہ سے کب آئے"؟

"رات" بابی فشر نے دھیمے سے جواب دیا " ایئر انڈیا سے۔۔۔ ہیر مائیکل کی کار میں۔۔۔ کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ غصے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی "کیوں! کیوں آئے تم! کیا ضرورت تھی! ۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

بابی فشر جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی "جیگوار ۔۔۔"

جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بو آ گئی تھی اور وہ زنجیر تڑا تڑا کر باہر آنے اور اس اجنبی کو کچا چبانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کندن اسے کھول کر نادر فشر پر چھوڑ دینے کے لیے لپکی لیکن پھر لوٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برت کی سل پر یورش شروع کر دی وہ سلیں توڑ رہی تھی "باب۔۔۔ باب بولو، کچھ تو بولو۔۔۔ اور کچھ نہیں تو گالی

رہی دو، اس سے بڑی جو تم نے مجھے دی ہے۔

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہوئے نادر فشر کی پاکیزگی کے بہانے اور اس کے دل کے راکیز پگھلنے پسیجنے لگے، چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پہ کوئی لحاف سے چلے آئے جنہیں اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے باپ بولا تم عورتیں سمجھتی ہو مردوں کے عصمت ہی نہیں ہوتی۔" کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی ہوئی منت اور آہ وزاری پہ اتر آئی۔

"میں نے عورت ہو کر تمہیں معاف کر دیا۔۔۔ باپ۔۔۔ اور تم۔۔۔۔"

میرے اور تمہارے درمیان۔۔۔۔۔ میں عورت ہوں۔"

اور بابی اپنا ہاتھ چھڑا کر سینے پر کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگی، پکارتی ہوئی۔ "باپ۔۔۔ باپ۔۔۔۔"

اور جب باپ نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اسے جاتے دیکھنے لگی پھر اسے خیال آیا۔ شاید۔۔۔۔

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا۔۔۔ "نا۔۔۔ در۔۔۔۔" اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرتی جذب ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

ماں نے باپ فشر کو نہ دیکھا تھا۔ "بیٹا تم کس سے باتیں کر رہی تھیں"؟ اس نے پوچھا کندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ ڈالنے کی کوشش کی اور نیچے دیکھتے ہوئے بولی اپنے آپ سے۔۔۔۔

کسی پہ اب تک ان سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ سچ بتا کون تھا؟۔

.... کہاں سے لائی یہ الجھن کی گانٹھ؟

"تم تو یہ مت پوچھو ماں۔"

ماں ایکا ایکی ڈر گئی ۔ اس نے بیٹی کے چہرے پہ دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی. کندن نے بالقصد چہرے پہ ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا، ہم عورتیں ہیں ... ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ، ماں کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ بچہ ہے ....؟

"اگر میرے لڑکی ہو گئی تو"؟

"لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی"؟

"ہوتی ہے مگر ....؟

اور پھر سب باتیں ان سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور نہ کبھی دے سکے گی ، دے گی بھی تو اس پہ ہزاروں دباؤ ہوں گے ، سماجی اخلاقی اور بچے کو کچھ پتہ نہ ہوگا ، ماں ڈری سہمی رہے گی.

گرجے میں لکھی نے 'کنفیشن' کیا تو ایک اور صورت پیدا ہوگئی جس نے نادر رائیکل، نادر رد بیلو، سسٹر پیپریر اینجیلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا بابی فنڑا بھی تک چپ اور دم سادھے ساری باتیں سن رہا تھا. لکھی نے کہا" وہ خواب میں آیا تھا۔"

اس پر معاملہ ابتر ہو گیا ۔" کون"، سسٹر اینجیلا نے پوچھا.
کندن بھی وہیں تھی اس نے لکھی کی مدد کرنے کی کوشش کی "سدھو"

اس نے کہا۔ مگر لکھی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اور بھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے۔ لکھی نے اچٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا... پھر آنکھیں جھپکتی ہوئی بولی،

"رام داس"

کیتھی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا....

لکھی قسمیں کھا رہی تھی جن پر کوئی یقین کرے تو مرے، نہ کرے تو بھی مرے عشائے ربانی کی یہ شرکت ختم ہوئی۔ حیران و پریشان کندن نے سسٹر انجیلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا "خواب میں آیا تھا... کیا یہ ہو سکتا ہے، سسٹر"؟ سسٹر انجیلا نے خود بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک مبہم سا جواب دے دیا۔

"کیوں نہیں؟ ...... سچ کہتی ہے، لکشمی رام داس"

فرداً فرداً فادر روبیلو اور فادر مائیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیئے گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راستے پر کندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا "کیا یہ ہو سکتا ہے ...."؟

فادر فشر نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کندن سے کہا۔ "نہیں"

کندن چونک گئی اور بولی "فادر... تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے"

"نہیں"

"کیوں نہیں"؟

اِس لئے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے۔۔۔میرا خیال ہے رات کے وقت سدھو چپکے سے چلا آیا ہوگا۔" کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا ۔۔۔ اپتی کے سب کام پر ماتا اندھیرے میں کرتے ہیں۔" مگر فادر فشر کو آخر حد تک پہنچاتے کے لئے کندن بولی "سدھو یا رام داس"؟

" سدھو"

"رام داس کیوں نہیں؟"

رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔۔۔۔اس کا کوئی وجود نہیں، وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں۔"

" ہاں مگر" کندن نے ضد کی۔" آیا بھی تو کسی کو پتہ نہ چلا؟"

" تم تو جانتی ہو" فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا "پھر خواب کتنا گہرا ہو جاتا ہے"

" ان جذبات سے معمور ہوگئی۔" باپ" ۔اس نے کہا۔ "اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے؟ کیوں نہیں شادی ۔۔"

" باپ فشر نے کندن کو وہیں روک دیا صرف اتنا کہہ کر۔" نہیں" ۔

" تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے باپ! اس دنیا کے سب دھندے کرتے ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو جاتا ہے، یسوع۔"

باپ نے پھر ٹوک دیا ۔"تم نہیں سمجھ سکتیں۔"

اور فادر فشر ایک ایک قدم سے دو دو سلیٹیں پھاندتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا۔ پھر میری کے حضور میں دعائیں کرنے رات کو اپنے مجرد بستر پر سوتے

اور روز آدھی رات کو اٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے ...... اس کے کچھ دیر بعد فادر فشر ہمیشہ کے لیے لیڈلیسن دس کو بن چلا گیا۔

اب کے زچگی کے سلسلے میں لکھی کو بہت کڑی ہدایات تھیں۔ کندن نے ایک سستی مگر چست چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا، اور وہاں کے اسپتال کی بیڈ بعض وقت ارجنٹ کیس کے لیے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میٹرنٹی کا خرچ برداشت کرنے کی لکھی میں ہمت نہ تھی، کندن مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک۔

لکھی زچگی کے سلسلے میں کوئی صاف برداشت کرنے کو تیار ہی نہ تھی — ماں سہاگنی نے سیخ پا ہو کر کہا "مر جائے گی کمینی —"

"ٹھیک ہے" — لکھی نے کھڑا سا سر ہلا دیا "چھٹی ہو جائے گی۔"

"ان چھوکریوں کو کون سنبھالے گا؟"

"خدا جس نے پیدا کیا۔"

"انہیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں؟"

"نہیں۔"

اور ناک تک بھری ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکھی مسکرا دی — اس کا مطلب تھا یہ وہی ہے جو وقت پہ عقل پھرا دیتا ہے، کسی اپنے ہی کھیل کے لالچ میں۔

اور تو سب ٹھیک تھا لیکن چپٹی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اس کی طرف دیکھ کر رحم آتا تھا، وہ اب تک

ماں کو مکمل طور پر اپنا سمجھے ہوئے تھی۔ ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ماں ہی اس کی روٹی اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد ٹکھی اسے نہ پوچھے گی، اس لئے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی بلکہ دوسرے بچے کے سلسلے میں الجھی ہونے کے کارن اسے فرصت ہی نہ ہو گی، اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہو گیا تو۔۔۔نہیں اس بنگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا یہ ٹکھی جانتی تھی اور ماں سہاشنی اور کندن بھی۔

دایا دن میں ایک دو چکر کاٹ جاتی تھی تاکہ ٹکھی کے چہرے پر شکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے۔ اس کے ساتھ طے ہوا تھا کہ وقت نبھا گئی تو ٹکھی کی تنخواہ سے دس روپے کاٹ کر اسے دیئے جائیں گی اور میم صاحب کندن بیس روپے اپنی جیب سے دے گی۔ ساتھ میں دھوتی، بلاؤز یا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈ اسکرٹ۔

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو ٹکھی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایا کو خود بہت اچنبھا ہوا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پر کوئی ہنسے، مگر۔۔۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ٹکھی پھر کھلکھلا کر ہنس دی دایا اس کا منہ دیکھنے لگی اور ڈر گئی۔۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنٹری عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئی تھی مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔ لیکن ٹکھی ـــ بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی، ٹکھی کی ہنسی سے دایا مایوس ہو گئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی ـــ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ ہی نہیں ـــ

دایا کے جاتے ہی لکھی رونے لگی ۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی جتنا وہ ہنسی تھی، وہ ایک ایسے جری پن سے جو عورت ہی کا حصہ ہے اپنے درد کو دباتی رہی ۔ حتیٰ کہ شام کے سات بج گئے۔

کندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی، اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ ماں رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لیے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی ۔

"یہ ۔۔۔" ؟ ماں نے کہا۔

"لکھی کی آواز ۔۔۔" کندن بولی اور پھر دونوں اندھیرے میں لکھی کے گھر کی ۔۔ طرف دیکھنے لگیں ۔ "ہائے سرب ناش" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا ۔ "دایا تو کہہ کر گئی ہے ہفتے بھر کوئی خطرہ نہیں ہے" اس کے بعد اور بھی ہو وہائے سنائی دینے لگیں ، ماں بھاشنی کی بے نقط گالیوں کا تانتا بندھنے لگا ۔۔ بیچ میں جگیشور کے بے تحاشہ بھونکنے کی آواز بھی شامل ہو گئی ۔۔

لیکن رک گئی ۔ اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اور چیخیں سنکر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھے اور ماں کے ڈر سے رک گئے ۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جو پتھر بنی بیٹھی تھی ۔ اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں ریوڑی چلی آئی ۔۔ روتی ہوئی متوحش اور مادر زاد ننگی ۔۔۔

"کندن ۔" ماں نے آواز دی "میں کچھ کھا مروں گی"
اس پہ کندن نہ رکی اور کوارٹر کی طرف لپک گئی ۔ ماں کو وہ دن یاد آیا جب اس نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے ہمیشہ کے لیے بھیج دینے کے لئے تیار ہو گئی تھی ۔ آج اسے ماں کے مرجانے کی پرواہ بھی نہ تھی ۔ یہ کیا رشتہ تھا، کندن کا اور لکھی کا ! ۔۔ سبھاشنی اٹھی اور اپنی کچی کنواری "بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے لئے ریوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی ۔

لیکن ماں سبھاشنی بھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے انتظار میں تھی کب یہ آواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، کندن کو روک لیا ۔" اگر تو جائے تو میرا مرا منہ دیکھے ۔"

دو گھنٹے ماں بیٹی کشتی کرتی رہیں ۔ کہیں نو ساڑھے نو بجے تولید ہوئی ۔ حرامی بچہ پیدا تو ہو گیا ۔۔۔ لیکن مرا ہوا ۔ وہ لڑکا تھا ۔

پیدائش کے فوراً بعد حیات و ممات سے بے خبر لکھی ایک تسکین کی میٹھی نیند سو گئی تھی جس کا احساس اس جانکا ہی کے بعد ہی ہوتا ہے ۔ کندن کو یاد آیا ۔ لکھی نے ایک بار کہا تھا ۔" خداوندا ! میں ایک لڑکا تو پیدا کر کے دیکھ لوں چاہے وہ مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو ۔ ۔"

فادر مائیکل نے بچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کرسچین بنے بغیر مر گیا تھا، وہ زندگی میں شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ کر سکا تھا ۔ لیکن اس کی اصل وجہ نہ فادر مائیکل نے بتائی نہ فادر روبیلو نے

اور نہ سسٹر انجیلا نے

ماں نے بنگلے کے دوسرے کونے میں گڑھا کھدوا، مردہ بچے کو دبانے کے لیے لکھی گھسٹتی ہوئی قبر تک چلی آئی۔ گھر سے شراب کی بوتل کا کھوکھا لیے جیسے بچے کا تابوت ہوتا تھا۔ کھوکھے میں ڈالنے سے پہلے لکھی نے بچے کو دیکھا اور جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔ اور پرے دیکھنے لگی۔ وہ رو بھی نہ رہی تھی جب تابوت کو قبر میں رکھ کر اس پر مٹی ڈالی گئی تو وہ لمحوں کا ایک ڈھیر بن گیا ایک ٹیلہ سا۔ لیکن کندن کہاں تھی۔ تھوڑی دیر میں کندن چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں سرد کا ایک پودا تھا جسے وہ جڑوں سمیت کہیں سے کھود لائی تھی۔

"یہ اس پہ لگا دو، ماں "

ماں کے ہاتھ سے کھرپا گر گیا۔ اس نے ایک تیز نظر سے یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر بیٹی کی آنکھوں میں ۔۔ اور پھر اپنے مٹی سے اٹے ہاتھوں کے ساتھ بیٹی سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد سب باتوں سے فارغ ہو کر ماں سپاشنی نے کہا "بیٹا، اب تو شادی کر لے "

کندن نے ماں کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا "تم نے کیوں نہ کی، ماں؟"

"تم جو تھیں ۔۔۔۔ میرا سب کچھ "

اور کندن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بکی

"۱۶؟"

"جی ہاں ..... ۱۶، تیسری قطار میں" بکی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا: "آپ کو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی صاحب، کنڈکٹر آپ کی مدد کرے گا۔

"شکریہ، شکریہ" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے ہوئے اس نے ایک اور چونی کونٹر پر رکھ دی، چونی جیب میں ڈالتے ہوئے بکی نے آنکھیں بند کرلیں جیسے اس کا دماغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی تھی اور رات کو اس عظیم الشان سینما میں ٹکٹیں بیچا کرتی تھی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لیے کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بک کر دینے کے عوض اسے چونی زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ایک بوڑھی، ہٹیلی ماں تھی جو کھانا ملنے میں ذرا سی دیر ہو جانے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی ..... اس کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اس کے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ آگ جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی، اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے .....

کچھ دیر بعد معمولے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان کونٹر کی طرف آیا اور آتے ہی اس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی کونٹر پر بجائیں اور بولا" لیکن مادم ---- وہاں تو کوئی لڑکی نہیں ۔"

بکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا:"کہیں باہر ہو گی۔ما،ب .... اس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

" اُف" نوجوان نے بیزاری سے کہا ۔ ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے مس ---ام ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔"

پھر وہ لڑکا کچھ دور جاکر ساگوان کے خوبصورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے ٹلز کو دیکھنے لگا اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے آج شب کو، سرخ لیبل پھاڑنے شروع کر دیئے ۔ پھر بکی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا :" مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے ۔"

بکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرادیا اور دل ہی دل میں اس کے خوبصورت بالوں کو سراہنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں اس کے بال، دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ گنجا نہیں نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دبلا۔ بس .... ٹھیک ہے ۔ او اس کے بال دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو .... اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بو آتی ہے ، حالانکہ شاید اس نے شراب نہیں پی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے، جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب کی بو آنے لگتی ہے ۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے اٹھا کر بڑے غور سے سینما کی چھت کا معائنہ کرنے لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے، وہ جانتا تھا کہ جب سینما میں روشنی گل ہو جائے گی تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے اور بہت خوبصورت دکھائی دیں گے چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہوگا اور وہ یقیناً اس منظر کو پسند کرے گا اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہے گا ... ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور ... اور یہ سچ ہے کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں دوڑائی تھی اور نہ قدرت کے اس ملکتہ کو جو کہ ہر رد ذرات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا۔ پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اس لیے پسند کرتا تھا کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اس دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ کی کو یقین تھا کہ وہ اس بے فکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی، البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے اس کی دیرینہ تھی کہ وہ بہت رحم دل تھی۔ اور شاید اسی لیے وہ اس کے متعلق اپنے تخیل کو محبت کی آلودگی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ ورنہ اس کے لیے یہ کس قدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر بکنگ آفس کے سامنے ہاؤس فل کا بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر جا بیٹھتی۔

برآمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا۔ اس لیے نوجوان کے کپڑے

کسی قدر آلودہ ہو گئے لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا، گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کے ہونے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا جو دائیں دیوار سے ہٹا کر مینجر کے کمرے کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اسی جگہ کو دیکھا جہاں سے وہ اٹھا لی گئی تھی۔ بکی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھا لی گئی ہو۔ گویا اس کا ادراک اس تبدیلی کو یک بیک قبول نہیں کرتا اور شاید اسی لئے اسے ۲۴ پرگنہ کے دیہات میں گذارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے ہیں، وہ دن جب کہ وہ تہذیب سے دور، دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب کلکتہ کے سے مہذب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹوں کے پلین پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوان کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اسے چونی ملتی تھی۔ اس کی انگلی نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی اور نوجوان کو بکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا۔۔۔ جیسے اسے ان کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو اور وہ ان ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا

ہو۔

چھبیس ...... ستائیس ۔۔ چوتھی قطار ...... بارہ ......

...... ہجی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جارکیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تھی ...... مسز وسوزا ...... خاہ! اس کے ساتھ مسٹر وسوزا نہیں تھے، وہ تھے یا نہیں تھے، ہجی ہلکی ہلکی سردرد میں بالکل بھول چکی تھی۔ اسے تو ان کی شکل تک یاد نہ رہی تھی، ہجی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا تھا کہ وہ اس چوٹی کو کوسنے لگی جو اسے اس کام کے لیے ملتی تھی۔

" جنٹلمین" ہجی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا" میں نے آپ کی سیٹ چوتھی لائن میں تیرہ پر رکھی ہے اور بارہ پر مس وسوزا کی جگہ ہے۔ ہجی نے جان بوجھ کر مسز کو مس کہا۔ آخر قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا، اور پھر ہجی کو اپنی جوانی عزیز تھی؛ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی، اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا۔

...... نوجوان نے اپنا سیٹ اٹھاتے ہوئے کہا "شکریہ"۔۔۔ اور ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

ہجی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر پلین کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ جب وہ ایٹی ڑے کو اپنے نزدیک سرکا رہی تھی تو ایک بدصورت سا لڑکا آیا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ہجی غور سے اس کے چہرے کی طرف

دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کم سن تھا اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا، البتہ جاننا چاہتا تھا، ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا تھا جو کہ اس کے چہرے کے بھٹے نقوش کو اور بھدا بنا رہا تھا۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونی بکی کی طرف سرکا دی بکی کا منہ کھلا رہ گیا "تم چاہتے ہو۔۔۔" وہ چونی اور چونی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے پلین پر جھک گئی۔ ہاؤس فل تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے لئے پہلے بک کی تھی، لیکن ساتھ کی سیٹ پر لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی، بکی نے سوچا اب وہ لڑکی ضرور آ بیٹھی ہو گی، کتنی خوب صورت تھی وہ لڑکی۔۔۔ وہ بلانڈ، اور اس کے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گذر رہی ہو۔۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لیے بنائے تھے۔۔ اس کے پہلو میں اس بے وقوف، بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا اس کی توہین کرنا تھا اور یہ چھوکرا نو آموز ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔ ۲۴ پرگنہ کی طرف کا رہنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ نہ تو وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہہ دے سکتا ہے، وہ

وہ گدھا تو اعلیٰ ستاروں کو پسند کرتا تھا اور کہیں سے دھان کاٹتا اٹھ کر کلکتہ چلا آیا تھا،

نوجوانوں کا ایک غول اس کی طرف بڑھا آرہا تھا لیکن نشستیں رک چکی تھیں، بلیچ سارے کا سارا ابکی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا کہ اب اس وجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ نوجوان اپنے اوور کوٹ تھامے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے،

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے، اس کے بعد موسم سون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے اور چند چھوکریاں اپنے گون سنبھالتی ہوئی سینما کی ایگزٹ ؟ کی طرف آکھڑی ہوئیں ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دیئے جاتے تھے اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے،

اس وقت ابکی کے سامنے اس دیہاتی نوجوان کے لیے ایک عجیب مادرانہ جذبہ پیدا ہوا، اس نے اپنے کمرے کے سامنے ہاؤس فل کا تختہ لٹکا دیا، اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی، اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دیدیا اور پھر خود اسے کنڈکٹر تک لے گئی مسلسل کانپتے رہنے سے اس چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا، کنڈیکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ

نمبر کی نشست پر بٹھا دیا، بکی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی۔ بلانڈ نے گھبرا کر اپنی بائیں طرف دیکھا، اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہونے میں کوئی شک نہ رہا، بکی نے سوچا، شاید وہ لڑکی بھی میری طرح رابطہ حسن کی بجائے اپنی چونی یا دس کے نوٹ کو پسند کرتی ہو، اس کے بعد پردے پھٹ گئے اور سینما شروع ہوا، انگریزی فلم، "میرا انام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے،" شروع ہوئی اور گانا ایک دلفریب ٹیون پر گایا جانے لگا،

ستاروں بھری رات کے نیچے،

بکی نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے دل میں ٹیون کو گنگنانے لگی، ستاروں بھری رات کے نیچے لیکن ابھی دوسرے شو کا پلین بنانا تھا۔ اور اسے تین ساڑھے تین روپے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھک چکی تھی، اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے بچانے کے لیے اسے ہال کا اندھیرا پسند تھا، وہ سوچنے لگی، ستاروں بھری رات کے نیچے کا دلفریب گانا سن کر اس بدمعوّت نوجوان کو کیا خوبصورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا ہال کی چھت؟ یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے؟ اس کے بعد بکی باہر نکل آئی، کنڈکٹر جانتا تھا کہ بکی اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لیے پکچر دیکھا کرتی ہے، اور پھر فوراً ہی مضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردۂ سیمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا

بہار رہا ہو، حالانکہ یہ بات نہ تھی ۔ وہ سکون سے ایک گانا بھی نہیں سن سکتی تھی، اُسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے دل کا برتن چھوٹا ہے، اور موسیقی کا ظرف بہت بڑا اور نغمہ اس کے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا، وہ آتا چھلکتا ہوا دل بلکہ باہر نکل آتی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارا اسے یاد آجاتا۔ جہاں اس کی محبت پروان چڑھی اور لٹ گئی، جہاں سے ہار د عورتیں اپنا گھڑا بھر کر چلی آتی تھیں، اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں گائے کے گوبر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے پوتا کرتیں اور نکی کا جی چاہتا تھا کہ ان بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علیحدہ کونے میں صبر و سکون سے پڑ رہے، اور ان ہی عورتوں کی طرح چارپائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا دیکھا کرے۔

وہ مینجر کے کمرے کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی۔ کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی، ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ نکی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور اس کے ساتھی کی نشست کی طرف دیکھا، وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لیے ویسے ہی اجنبی تھے، اور اپنی اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھے تھے، اگر وہ چھوکرا طریقے سے اس خوبصورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی لیکن وہ تو گم سم بیٹھا تھا۔

اب باف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا لیکن وہ باہر چلا آیا اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔

ہلو مس۔۔۔ مام اس نے باہر ببکی کو دوڑتے ہوئے کہا۔

ببکی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ہلو۔۔۔ بوائے، انجوائیڈ اٹ (کیا خوب لطف ملا نا)

اس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا۔ مام۔۔۔ میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس کے بعد وہ ہکلانے لگا، میرا چچا گدار پور میں دکان کرتا ہے۔"

ببکی کا جی چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا۔ اور ببکی بھی یک لخت پریشان اور اداس ہو گئی۔ اس کے سر میں زیادہ درد ہونے لگا۔ وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کر لے گی تھی، وہ بہت رحم دل تھی۔ اس کے بعد جب شو ختم ہوا تو ببکی نے مینیجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی بدصورت جوان باہر آیا ببکی اس کے قریب چلی گئی، بولی۔

ہلو بوائے۔۔۔ تم کہاں کا رہنے والا ہے؟

"برش پور۔۔۔ ۲۴ پرگنہ کا۔"

"میں جانتی ہوں برش پور۔۔۔ میں ایک دفعہ مسٹر دے کے ہاں ایک ماہ ٹھہری تھی۔

رے؟ ہاں، ہاں" لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا۔ میں رے کو

جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا۔ آپ اتنی مہربان کیوں ہیں۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں"

"نلینی" بکی بولی۔۔ لیکن یہاں سب لوگ، مجھے مارگریٹ کہتے ہیں مسٹر رے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا لیکن مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں انہوں نے ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی، وہ لڑکی میری ماں ہے۔۔۔ اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتے ہو۔؟

چھوکرے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی ہوٹل چلیں ہم کافی کی ایک پیالی پیئیں گے۔"

اور وہ دونوں فرلپو کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دودھیا لیمپ دور سے چاند کے مانند دکھائی دیتے تھے، مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ دور سے اصلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے۔ نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ ان بلبوں کی طرف اشارہ کرکے کہنا چاہتی تھی، بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار شاید دودھ کے مٹکے چڑھا جاتا تھا کافی کے لیے۔ مارگریٹ نے کئی چیزوں کا آرڈر دیا، لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے

تھے ۔ مارگریٹ پوچھتی۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

"نامعلوم"

"سلاسج ... کہو سایسج"۔

"سایسج"۔

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"کٹلس ... کہو کٹلس۔

کٹلس"

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا تو مارگریٹ اسے درست کرتی، جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نام لینے سکھاتی ہے۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے تو اسے درست کرتی ہے۔

کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس لڑکے نے تھام لیا اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر بل پر رکھ دیئے۔ مارگریٹ کا خیال تھا کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہوگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس بات سے تو واقف تھا۔ ایسے ہی جیسے سینما میں چونی زیادہ دے کر عورت کے ساتھ سیٹ بک کروا لینے کا طریقہ اسے کسی نے بتا دیا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر یا کھانا کھا کر اس

کے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہو گا۔

مارگریٹ نے بتایا۔ کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا تو اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ بولئے، کیا تم آج شب میرے مہمان بنو گے؟ ... میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے۔

میں تمہیں بتاؤں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا، جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا، یہاں تم اسے نہیں پا سکو گے ... ہاں تم اس عورت کو دیکھ لو گے، جو کلکتہ میں ہے"۔؟

⁂ ⁂ ⁂

دلوالہ

روپ متی، میری نند جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی کی نشانی اس کا بدلن ہی نہ تھا، اس کے لچھن بھی تھے..... وہ اس کا چونک چونک کر بات کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے وجہ اداس ہونا، شک کرنا اور پھر سب سے بڑی بات بیکار کی راز داری۔۔

مجھے دنیا کبھی اچنبے کی بات نہ معلوم ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی بڑا بھید دکھائی دیا۔ ہاں، بارہ ساڑھے بارہ کی تھی، جب میرا بیاہ ہو گیا اور میں مندروں کی اس بستی، دیولی نگر چلی آئی۔۔۔ یہ نیچے چھتے گچ ہیں جو گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور ساج کی لکڑی کا بڑا اچھا ٹکسٹ ہے، سب تھی بنا تھا۔ ہاں لوہے کے یہ موٹے موٹے کیلے بعد میں گاڑے گئے تھے، اور دروازے پر گنیش جی کی مورتی، یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی۔

میں یہیں، ہوا محل کے اس چھجے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لا کھا لکھوٹا مجھے خود برا لگ رہا تھا۔ سسر، جیٹھ وغیرہ بھی پیڑھی پر گئے تھے، وہ ابھی مندر سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ، بھی شہر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتہ تھا کہ دیش بھر کی ارنڈی قبضے میں کرنے گئے ہیں۔ ایک بار اس پر قبضہ جم گیا تو اپنا گھر

سونے کی اینٹوں سے بھر جائے گا، اگرچہ بہت سوں کے دیوالے نکل جائیں گے۔

کھاتا پیتا گھر، یہاں سبھی فیشن کے طور پر کام کرتے تھے۔ کھانا پکانے کے علاوہ اور کیا تھا... سویرا ہوتا تو ہم سوچتیں، کیا پکے گا؟ دوپہر کو تھوڑے کپڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کے بعد، شام کو کیا پکے گا؟ کوئی پوچھے، گھوم پھر کر ادھر اور ادھر ہی پہنچتا ہے تو یہ دبدا کیسی؟ وہی روز کی باتیں، روز کے آدمی۔ ساس میری دیکھنے میں بری نہیں تھی۔ لیکن کبھی جھنگو ہی اک اچھی لگنے لگتی... اس لیے جب گھر سے جی بھر جاتا تو میں یہاں آ بیٹھتی۔ تم نے دیکھا ہے نا، بالو کی ماں، یہ چوبارہ نیچے سے یوں ہی سا لگتا ہے، لیکن یہ ہے رام جی کا پشت پوان، ایک اٹھ کلیا کمل، لال سیمنٹ کا جیسے تھامے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آر پار دکھائی پڑتا ہے۔ بھنگن، چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرنے والے مزدور، یوں غریب، پر بدن پر محنت کا سرور، چہرے پر صحت کی چمک، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوٹتے جا رہے ہیں۔ اس بات کی بھی پروا نہیں کہ مجوری ملے گی یا نہ ملے گی، بھر آنے والے جن کی چھاتی کے تسلوں میں گالیاں ہی ابلتی رہتی ہیں دوسروں کو کم ہی دیتے ہیں، اپنے جانوروں کو زیادہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ اور اس پر بڑے خوش مارا ماری کرتے جا رہے ہیں، تیز تیز جیسے سویرا پورب سے کرنیں پھینکتے ہوئے امنڈتا ہے، اِدھر چھپاٹا، اُدھر چابک۔ لوگ یوں اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں جیسے رات کا ابر اِدھر دل

سا

ہوتے ہی کوٹھریوں میں میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں بہا چپتا ہے۔ نیم، دلال،
سیٹھ باندھوتی کا پلو سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو بیچ سڑک کے
جا رہی ہیں اپنی لائنہ ؍ یہ ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا اور
پیچھے مانس کے لودے چلے آتے ہیں، جیسے کسی نے بڑے بڑے تکیے باندھ
دیئے ہوں، چلتی ہیں تو پیچھے سے بدھ دیر بدھ دیر کا جاپ ہوتا ہے، پرسلو کی
تھالی ہاتھ میں، پانڈے جی ساتھ ہیں، دنیا جہاں سے بے خبر، برائے نام گھونگھٹ
کاڑھے، پتہ نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں، بڑے سے بڑا لوہے کا ڈنڈا بھی
ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا، پھر اپنی جات برادری کے سیٹھ، جات
باہر کے بیوپاری جن کی ٹڈیوں تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ نیچ ذاتوں کی تھیلیاں، جن
کی ڈوریاں تک کمر میں بندھی دکھ رہی ہیں، تس پر بھی چھوکریوں کو گھور رہے
ہیں، گھورتے مسٹنڈے بھی ہیں لیکن ایک کی نگاہ میں پل پڑتے والا پیار اور
آشا، دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشد چھوکریاں کبھی تو ان سے نہیں
شرمائیں، شرمائیں کرنت!

ایسی باتیں دیکھ کر جی اور گھبرا جاتا ہے، پھر میں سامنے دیکھ لیتی ہوں۔
پورا مارواڑ دکھائی پڑتا ہے ... پتھر ہی پتھر، ریت ہی ریت ... سورج کی
روشنی آڑی پڑتی ہے تو ریت کی کنی کنی دمک اٹھتی ہے ... معلوم ہوتا ہے ان
گنت مہریں پڑی ہیں اٹھا لو اور اندر باہر سب بھر لو۔ دریش بھر کا سونا روپا اُسی
دھرتی میں چلا آیا ہے۔ بس یہی چھوٹی چمک دمک ہے۔ ہریالی کہیں بھی نہیں
کہیں کوئی جھاڑی یا ننگی دوب دکھائی دے جاتی ہے لیکن پیڑ نام کو نہیں۔

دور وندھیا کے آنگن میں کوئی ٹنبا کا پیڑ کھڑا ہے یا چنبل کے کنارے بجا سل بُرلا رہا ہے۔ وہ بھی نیچے سے ٹنڈ منڈ۔ اوپر ایک گپھا سا ہے وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب سونا لے لے اور تھوڑی ہریالی دے دے ماں مٹی میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں ٹھینگے کی طرح ... اس کا کہنا ہے کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہو بیٹی کا، کھڑکی میں بیٹھی ہے تو گنکا میں کہتی ہوں، یہی حساب تو پھر ہماری طرح سبھی گھریلو عورتیں گنکا دیشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ ملے تو اس سے مر جائیں... ہے نا یالو کی ماں! کھڑکی کے لیے عورت ہو نہ ہو، عورت کے لیے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اس دن ہمیں کون روک سکتا تھا؟ گو کل اشٹمی کا دن تھا۔ گوپیوں کے کاہن آج کے دن پیدا ہوئے تھے، رادھا یا نار میں بڑی گہما گہمی تھی، رام رام ساری لوکائی امنگ کی طرح باہر چلی آئی تھی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھاتی جا رہی تھی... سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بھی بہت تھیں جیسے ان کے بنا سب ادھورا ہے۔ دھکے پڑتے تو برا مانہ بناتیں، اوپر سے گالیاں دیتیں بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ ہوتا تو باہر ہی کیوں نکلتیں۔ یہ عجیب بات ہے ہم عورتیں جس بات کو پسند نہیں کرتیں، آخر میں وہی کرتی ہیں، ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں لیکن ہمارے من کا ایسا ما الو کھا ضرور ہے ہر دل کو اس بات کا کیا پتہ؛ وہ تو سارا پڑھ لکھ کر بھی جانگلو ہی رہتے ہیں بس بید جے فلاں کام کرو، نہیں تو ہم جان سے مار دیں گے یا خبردار جو ساور تھی کے ساتھ منڈوے کو گئی۔ وہ اچھی عورت نہیں ہوٹلوں میں جاتی ہے، کوئی پوچھے

تم کو کیسے پتہ ہے جی! نہیں جانتے۔ جتنی دیر میں ان کے من میں ایک وچار آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کر نکل جاتے ہیں۔ ہاں، تو اس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ چڑت مڑت، رنگ، بانکڑی اور گہنوں کی نمائش تھی، سب ایک عجیب خواہش سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں۔۔۔ پلو سر سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے کو لٹکی ہوئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں، جو گھر کے بھیدی نے باہر لٹکا رکھی ہیں تاکہ باہر کا چور ان کے سہارے چلا آئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندر کود پڑے پھر کیا ہے، سامنے تجوری پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس ہے، ہمت ہے تو توڑ لے۔

کہاں تو اکیلے ہی بیٹھی تھی، کہاں روپ متی، ساس، دوا، بھی آگئیں بھی پتہ چلا دوا تو کب سے آ بیٹھی تھیں۔ اندر کے مندر میں گھنٹی بجا رہی تھیں، دوا اور ساس دونوں باہر دیکھ رہی تھیں، لیکن چہرے پر کوئی اثر نہیں۔ منہ بیرنگ لفافے کی طرح، پیسے دو اور چھڑالو نہیں تو بھیجنے والے کو واپس وہاں روپو کا منہ کھلا تھا۔۔۔ میں نے کہا، "روپو! تو ادھر آجا، میرے پاس۔"

بولی "نہیں بھابی میں ٹھیک ہوں۔"

پیچھے سے دوا بولیں۔ "ارے! پیار سے بلاتی ہے، جاتی کیوں نہیں"؟

روپو نے شک بھری نظر سے میری طرف دیکھا جیسے مجھے اس کی کسی بات کا پتہ چل جائے گا۔ میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گا اور وہ اٹھ کر میرے پاس آگئی، میں نے اپنی بانہہ میں جو اسے جکڑا تو پتہ چلا کہ اس کے کولہے کتنے بڑے ہوگئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی روپو کچھ بھی نہیں تھی۔ اب بھی

کچھ ہے۔ ابھی تو میں نے اس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی، کہ ساس کی آواز آئی "بہو سر ڈھک اپنا، کیسے بیٹھی ہے"!

میں نے اسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی، میں تم سے سچ کہتی ہوں بالو کی ماں، مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے سر پر کپڑا نہیں ہے، ننگی ہی بیٹھی ہوں ان عورتوں کی طرح جو سامنے بجار پے میں کھڑی تھیں، اور تن من سبھی کو ہوا لگ رہی تھی، میں پھر دونوں ہاتھ یہاں کھڑکی میں ٹکا ان پہ ٹھوڑی رکھے نیچے دیکھنے لگی۔

نیچے عورتیں تو اب کہیں کہیں تھیں، مرد ہی مرد تھے چھوٹے اور ۔ کوئی لمبا کوئی ناٹا، کوئی چھوٹا، کوئی موٹا کسی نے داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کوئی صفاچٹ، لیکن سر کے بالوں کے گھونگھریا کتنے ہی پر چپک رکھے ہیں، کوئی پان کھا رہا ہے اور تھوک رہا ہے، کوئی بیڑی کی راکھ چٹکی سے گراتا ہے، کوئی لڑتا ہے، کوئی گالی کھاتا ہے، لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں بجلی کے تاروں کی طرف۔۔

اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے، ایکدم یہ اتنے کہاں سے چلے آئے پھر میں نے سوچا، آخر ماؤں نے ہی جنے ہیں، آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑے۔۔ بیچ میں ایک ٹھٹھ سا بندھا تھا اور باقی سب کے سب اس کے چاروں طرف گھیرا بنا کر کھڑے تھے، ان کے سروں پہ کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسی لٹک رہی تھی، جس کا ایک سرا نگرڈل کے گھر اور دوسرا چھندواڑے کے سیٹھ کے یہاں بندھا تھا، اور اس رسی کے سہارے بازار کے بیچوں بیچ مٹکی لٹک رہی تھی، یہ وہی مٹکی تھی جس میں ماتا جسودھا مکھن رکھ دیا کرتی

تھیں، اور اوپر ٹانگ دبتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں نٹ کھٹ اس تک نہیں پہنچ پلٹے گا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر چڑھ کر پہنچ ہی جاتا تھا۔

تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال، اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر، دوسرا اوّل آیا، تین آدمیوں کا اور پہلے چھ آدمیوں کے کندھوں پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر ہی بھیڑ میں سے سانولے رنگ کا ایک نوجوان لڑکا نکلا اور پھرتی سے باقی سب کے کندھوں پر یوں چڑھ گیا جیسے وہ آدمی نہیں، سیڑھیاں ہوں۔ اوپر پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیض میلی تھی اور اس پر رنگ گرا ہوا تھا۔ بٹن کھلے تھے۔۔۔۔ میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو۔ میرا دل دھڑک اٹھا، اس لیے بھی کہ اس کے پاؤں ابھی جمے نہیں تھے، وہ گر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پاؤں کترائے اور وہ جھک گیا اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے پاؤں جم چکے تھے۔

لوگوں میں اک شور سا مچ گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھے اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بجلی سی میرے شریر میں دوڑ گئی، پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں گاڑ دیئے اور سر بل اوپر اٹھا، ہاتھ ملائے کانپا سنبھلا۔۔۔۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے خون میرے منہ کو آ رہا ہے، میری کنپٹیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر میں اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مٹکی تھام لی۔ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں میں اسے تھام رکھا تھا۔ اس

نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی، روپو بیٹھی تھی ,ساس اور ددا بیٹھی تھی مجھے ایسا لگا, جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جیسے وہ مجھے جانتا ہے, میں نے اسے دیکھا ہے لیکن نہ جانے کتنی پرانی بات ہے جیسے وقت نے تصویر کو دھو ڈالا ہے، ریکھائیں نس رہ گئی ہیں ,

...میں نے چور نظر سے روپو کی طرف دیکھا -وہ ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی ,جیسے بچے تماشے میں منہ کھول کر بیٹھتے ہیں ,مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا ہے ,اس میں سے پسینہ نکل رہا ہے ,مجھے یقین ہے مجھ سے بدبو اُٹھ رہی ہو گی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں ,

اب تک میری جیٹھانی تھی ,ایک ہم تھی جس کے یہاں لاکھ جتن کرنے پر بھی کوئی بچہ نہ ہوا ,اور ایک وہ تھی ,ہر سال جس کے ہو جاتا تھا اور جیسے وہم کی بیماری ہو گئی تھی -ایک ہم تھی جسے کوئی چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی ,اور ایک وہ جیسے ہر چیز گندگی سے پٹی معلوم ہوتی تھی ,ہر وقت ہاتھ ,منہ ,کپڑے دھوتی رہتی تاں کر نل ,اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آئی تھی ,ہاتھ تولیے سے نہ پونچھے تھے کیونکہ گھر میں ہر آتا جاتا اسی تولیے کا استعمال کرتا تھا ,آکر اس نے گیلے ہاتھ جو جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پر یوں پڑنے لگا جیسے اوڑھنگی زمین پر برکھا کی پہلی بوندیں پڑی ہوں ,

....میں نے مڑ کر دیکھا ,روپو جا چکی تھی ,شاید میرے پاس بیٹھ کر اسے سینک لگ رہا تھا یا پھر وہی اس کی تھمیکی حرکتیں! کبھی پتہ نہ چلا اس کا ، اگلے پل کیا کرے گی ,اتفاق سے نظر نیچے گئی تو وہ اسی ساجن کے پھاٹک کے باہر کھڑی تھی اور

اشٹمی کے جلوس کو دیکھ رہی تھی، جس میں وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر مٹکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا لیکن وہ مٹکی جانے کس مٹی سے بنی تھی، آخر میں وہ اسے مکے مارنے لگا، جب اس پر بھی نہ ٹوٹی تو اس نے مٹکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ مجھے کیا ہوا میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں موند لیتی، مٹکی پھوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے،

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو ضرور کچھ چوٹ لگی تھی لیکن چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے ایک میلا کچیلا رومال نکالا اور گردن پونچھ لی۔ پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اترنے لگا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے، نیچے کے گھیرے پر پہنچ کر وہ لڑکھڑا گیا، وہ گرا... میں لپکی لیکن ان گنت لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا لیا۔ ددا نے میری طرف دیکھا اور ہنس دیں۔ ساس نے ناک بھوں چڑھائی۔ میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو لڑکا کہیں بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یوں ہی مورکھوں کی طرح اس طرف دیکھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا، نیچے لپک جاؤں اور اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں، کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ لیکن ... میں یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی؟ ... من کو مار کے یہیں بیٹھی رہی اور سوچتی رہی،

رات آگئی، اشٹمی کی رات۔ میرا من تب تک بہت بوجھل ہو چکا تھا تنکا توڑ دوہرا نہ کیا تھا، پر اتنا تھک گئی تھی کہ بس... آج گھر میں ایک چیز کام کی ہوئی

اور وہ یہ کہ ارہر کی دال نہ پکی تھی اور نہ اُرد کی، نہ کڑھی، میری جیٹھانی نے کٹھل کی وہ پیاری سبزی پکائی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی، بالکل ماس کا سواد تھا، ہاں، بالو کی ماں، تم سے کیا چھپانا؛ میں نے ماس کھایا ہے، چوری چوری کئی بار کھایا ہے،

روپو آگئی۔ ویسے ہی بے وجہ ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے اٹھنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن وہ تھی کہ اپنے ہلکے پاؤں پر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھسلتی جا رہی تھی۔ آتنی چھپک اس میں کہاں سے چلی آئی؛ میری طرف شرارت سے دیکھ کر مسکرائی اور بولی،

"بھیا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی"؟

میں نے کہا۔ "کیوں"؟

روپو سمجھتی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پر میں شرما جاؤں گی، جیسے دوسری عورتیں اپنے پتی کے نام پر شرماتی ہیں، لیکن ہمارا بیاہ کوئی نئی بات نہ تھی اور شرمانے کی آتنی بات ہی کہاں رہی تھی،

روپو بولی، پتہ بھی ہے آج ہنڈے ہیں؛ وہ جھونٹا دیتی کہ آسمان سے جا لگتیں،

اونہہ میں نے منہ بنا کر کہا اور چپ ہو گئی،

روپو جنم اشٹمی کے دن مجھے اور اپنے بھیا کو جھولے میں بٹھا کر بہت خوش ہوتی تھی، پتہ نہیں اسے کیا مزہ آتا تھا، شاید وہ سمجھتی ہو گی کہ رادھے شیام کی جوڑی ہے، جب لمبا اور تیز جھونٹا دیتی تو میں ڈر کر ان سے چمٹ جاتی اور روپو دیکھ کر

بہت ہنستی۔ بیچ میں میں دو ایک بار گر گئی اور یہ مجھے تھام نہ سکے۔ میری جیٹھانی کے بچوں نے بیر کھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ پھینک رکھی تھی۔ ایک میرے سر میں گھس گئی۔ تب سے میں نے جھولے ہنڈولے پر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ بیٹھتی بھی تو ان کا سہارا لینے کے بدلے رسی تھام لیتی جس سے روپو کے سب تماشے کا تماشہ ہو گیا۔

روپو بیٹھی رہی اور طرح طرح کی شرارتیں کرتی رہی۔ کبھی وہ میرا کے بھجن گانے لگتی کبھی باجے میں فلمی ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر ساتھ ناچنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔۔۔۔ تب تک ان کے پتا اور بڑے بھائی آ گئے تھے۔ میں جانتی تھی وہ ساس اور جیٹھانی ہنڈولے دیکھنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی، اب سانول داس کے دیول جاتے کے لیے کسی نے کہا تو کیا بہانہ کروں گی! تبھی مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا جس نے ٹکی چھوڑی تھی

"روپو تو نے دیکھا تھا آج کا جلوس"

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ "ہاں بھابی۔"

میں نے پوچھا۔ "اور وہ نرپالی دیکھی تھی؟"

روپو بولی۔ "ہاں۔"

"اور وہ لڑکا؟"

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر اقرار میں۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے تیز نظر سے مجھ کو دیکھا اور چپ کھڑی رہ گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی، الٹا میں ہی پوچھنے لگی۔ "کون لڑکا بھلا"؟

روپو نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا، "مجھے کیا معلوم"؟

"ارے وہی"! میں بولی، "مٹکی پھوڑ......"

اور صرف روپو کو چھیڑنے کے لیے میں نے کہہ دیا، "کیسے تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تھا۔ اشارہ کرتا تھا، جیسے اچھی طرح جانتا ہو۔" میں چاہتی تھی، روپو مجھے چھیڑے، مجھ سے کہے۔ "وہ تمہیں بلا رہا تھا، بھابی"... لیکن روپو چپ رہی۔ نہ صرف چپ..... اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا، جیسے میرے اندر کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لیے تو میں بھی گھبرا گئی، پر میں نے سوچا کہ میں نے کیا کیا ہے، جو خواہ مخواہ کی چور بنوں، میں نے دلیری سے روپو کو اور بنانا شروع کر دیا، جب وہ بہت گھبرائی تو میں سمجھی، اس کی تو عادت ہے۔ مجھے کیا پتہ، آج کیا ہونے والا ہے؟ میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا، کیسے سر مار مار کر مٹکی پھوڑی تھی اس نے"؟

روپو اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی، میں نے دیکھا، بغل سے اس کی دھوتی پھٹی ہوئی تھی، اور اس پہ خون کے کچھ دھبے تھے.... روپو سال بھر سے رجسبوّلا ہو گئی تھی، میں نے من ہی من کہا، وہ پھر شروع ہو گیا ہے، اور یہ پھوہڑ نہیں جانتی"۔

"دھوتی تو بدل کتیا"، میں نے لفظوں کو تھوڑا چباتے ہوئے کہا، "پھٹی پڑی ہے، سب خون لگا ہے"۔

روپو کچھ مڑی اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں کو چھپاتے ہوئے بڑبڑا کر باہر نکل گئی، میں نے اس واقعہ کو کوئی ایسا نہ

سمجھا ایسا تو لگ بھگ ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہولے ہولے وہ اپنے آپ کو سنبھالنا سیکھ لیتی ہے، کئی تب بھی پھوہڑ ہی رہتی ہیں ...... میں نے سوچا یہ بھی پھوہڑ ہی رہے گی، روپو۔

رات کو جو کچھ ہوا، اس سے مجھے پتہ چلا، یہ سب جادو "کتیا" کے الفاظ نے جگایا ہے۔ مجھے کیا معلوم، بابو کی ماں، تو تو جانتی ہے، ہم یونہی پیار سے بھی ایک دوسرے کو کتیا کہا کرتی ہیں۔" میرا مطلب یہ تھوڑی ہی تھا، ہم بنڈے پر گئے۔ روپلے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے دیش میں کیا کمی، کنجوس لوگ پیسے پیسے کے لیے مرنے والے .... شادی بیاہ تیج تیوہار پر سب کونوں کھدروں میں پڑی پونجی اٹھا لاتے ہیں اور بیچ چوراہے کے رکھ دیتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں۔ دیکھو، دیکھو اور جلو۔ میں کبرت داس ہوں جس کی دھن باد میں کوئلے کی تین کانیں ہیں، کلکتہ میں ربڑ اور پلاسٹک کا سب سے بڑا کارخانہ بمبئی میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روئی سے بھرے پڑے ہیں۔

تو سانولے داس کے دیول میں لاکھوں کا چڑھاوا چڑھ گیا۔ میرے سسر نے موتیوں پر سونے کا پتر چڑھوا دیا اور شیام سندر کی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوا دیئے۔

میں اگرچہ تھکی ہاری تھی لیکن ساتھ چلی گئی۔ یوں ہی .... ایک آشا کے ساتھ اور کچھ نہیں تو چہل پہل ہی دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے۔ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں سوا دو چار دھکوں کے کچھ نہ ملا ... اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے۔ روپو نہیں آئی تھی۔ سب خوشامد کرتے رہے

پر ردلپو نے ایک ہی نہ پکڑ لی تھی ۔ سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے ، اس لیے ساری پرواہ کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پرواہ نہ کی ،

لوٹتے سمے اور گھر پہنچ کر میں نے بار بار سوچا ، یہ ہی آجائیں ، لیکن انہیں کیا پڑی تھی ، انہیں تو دیش بھر کی انڈسٹری چاہیے تھی ، دنیا بھر کی دولت چاہیے تھی ، پیسے اور پیسے کے علاوہ انہوں نے کچھ سوچا ، نہ ان کے باپ دادا نے ۔ ہماری کتنی اچھی ہوتی ہے بالو کی ماں ہم اپنے پتی کے ساتھ باہر جاتیں ہیں تو کہتی ہوں ، اس بات میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ وچار ہوتا ہے کہ باہر جائیں اپنے آپ کو دکھائیں اور جب کوئی دیکھے تو اپنے ہی آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور کہیں ، بھگوان نے سب دیا ہے ، تم کیا سمجھتے ہو ؛ تم بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لو ، آہیں بھرو ۔ ۔ ۔ جلو ، مرو ۔

ہاں ، ہم اتنا ہار سنگھار ، گہنے کپڑے کیوں پہنتی ہیں ؛ اسی لیے تاکہ کوئی دیکھے ، کوئی ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس انکار میں کتنا اقرار چھپا ہے ۔ من کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے ، جو آتے جاتے من چلے کی ہمت کو للکارتی ہے ۔

گھر آتے ہی میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ اندر سے دروازہ بند کر کے میں نے سب کپڑے اتار دیئے اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی ، کبھی ادھر سے کبھی اُدھر سے پھر بتی بجھا کر ایسے ہی بستر پر لیٹ گئی ۔ باہر کسی نے ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹایا ، میں چونک پڑی " کون " ؛ ۔ میں نے پوچھا ۔

دھیرے سے آواز آئی "میں، روپو"۔

میں نے پاس پڑی چادر لپیٹ لی اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ روپو اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی، روئے جا رہی تھی۔ آتے ہی وہ میرے پاؤں پر گر پڑی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی "میری لاج رکھ لو بھابی، میں مر جاؤں گی۔ کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہ جاؤں گی۔"

میری سمجھ میں جب کوئی بات نہ آئی۔ لیکن ہم عورتیں.... میں نے یوں ہی کہہ دیا "نہیں میں کسی سے نہ کہوں گی..." اور پھر یوں ہی ..."کیا ہوا؟"

روپو بولی "تم ٹھیک کہتی ہو بھابی۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔"

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"اب بتو ہنت۔" روپو بولی "وہی مٹکی پھوڑ"۔

"تیرا ستیاناس۔" میں نے دل میں کہا۔

روپو بولی۔ "جب بھی میں لادھا بازار سے گذرتی، وہ نکڑ پر مجھے مل جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا۔ لیکن میں پاس سے گذر جاتی، برے برے منہ بناتی، گالیاں دیتی... لیکن آج پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، میں بھیڑ میں چلی گئی، صرف اس کے ایک انگلی اٹھانے پر...... اور پھر ہم دونوں بھیڑ سے نکل گئے اور شیو مندر میں چلے گئے جہاں یاتریوں کے لیے کوٹھڑیاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جا رہی تھی، آخر میں میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہو جاؤں لیکن مجھ سے کچھ کرتے نہ بنا... اس کے بعد ہم اندھے ہو گئے۔"

میں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں، میرا سارا شریر کانپنے لگا۔ پہلے مجھے غصہ

آیا گھن پیدا ہوئی، پھر سب کچھ جاتے اپنے آپ ڈھل گیا۔ میں جی ہی جی میں اپنی
مورکھتا پر ہنسی۔ مجھے تبھی کیوں نہ پتہ چلا جب میں نے روپوسے یہ سب کہا تھا
ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے جب روپو نہائی ۔۔۔۔ اور آج ۔۔۔۔" اچھا، اچھا
تو چنتا نہ کر۔ میں نے روپو سے کہا "تو نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو کسی ماں کی
بیٹی نے نہیں کیا۔ لیکن اب تو اپنے آپ کو سنبھالو۔ مہینہ بھر اپنا حال تیاتی رہنا
موئی! کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ سویرے میں تجھے میتھرے ابال کر
دے دوں گی اب تو سو، رہ، یہیں، میرے پاس، کہاں جائے گی، اس
اندھیرے میں سب سوچیں گے، یہ کیا ہو رہا ہے، کون چل رہا ہے۔ اس
آدھی رات کے وقت۔

۔۔۔۔ اور سن! میں تیرے بیاہ کی بات چیت چلاؤں گی، تو اون،
آں نہ کیجو، کنا بھی ہے تو بس دکھاوے کے لیے مرا اتنا ہی جتنا ہم سبھی کرتی
ہیں۔ مٹکی پھوڑ کوئی یوں ہی ملے ہے، راج مجور، ان کی تو سوچ بھی مت۔۔۔
ہاں ۔۔۔ جو بات نہیں اچھی نہیں اچھی ہے، اور جو اچھی، سو اچھی ہے۔ بھگوان
نے تو مرد عورت بنا دیئے اور جب سے دنیا بنی ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے
بھاگ رہیں اور بھاگتے رہیں گے۔ جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں! لیکن وہ
بھی ایک راستے پر جاتے ہیں۔ یہ نہیں اس گلی بازار سے راستہ کاٹا اور پکڑ لیا
ایک دوسرے کو۔ ایسا ہو تو یہ دنیا، یہ سنسار، یہ دھرتی، یہ آکاش سب
نشٹ ہو جائیں۔ سال کے دن ہی کتنے ہوتے ہیں۔ تین سو پینسٹھ ان میں
سو پینسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار سورج چاند

کو پکڑ لیتا ہے، اور بس۔

.... اس لیے منش نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے، بیاہ کا راستہ۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں، بیاہ ہوتا ہے تب ماں، باپ، بھائی بہن خود لڑکی کا ہاتھ لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں... پھر تو کوئی راجہ مہاراجہ، جج دیوان بھی کچھ نہیں کر سکتا "

اور میں نے روپو کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہت کچھ تسلی ہو گئی تھی میرے پاس پڑے پڑے وہیں سو گئی... نیند تو نہ آئی تو مجھے۔ یونہی جمائیاں لیتی ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کروٹ بدلتی رہی کبھی کبھی میرا ہاتھ روپو کے شریر پر پڑ جاتا لیکن وہ بے ہوش پڑی تھی، سب کچھ کہہ سنکر ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی، اور میں...؟

منکی بچھوڑ... روپو کے بھیا... روپو.... آئینے میں اپنا شریر سبھی کچھ سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سوچنے لگی، یہ جو روپو سے کہتی رہی ہوں، سچ بھی ہے۔ اور جھوٹ بھی، سچ اس لیے کہ کوئی اصول تو ہونا ہی چاہیے۔ یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے ملتے پھریں... تو اولاد کو کون سنبھالے، پریوار کیسے بنیں....؟ اور جھوٹ اس لیے کہ بیاہ کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے، پھر دھیرے دھیرے عورت مرد ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر کچھ جاننے کی بات ہی نہیں رہتی۔ جیسے کوئی آدمی ہر سال آبو جایا کرے یا سوسر تحصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے۔ پھر مسوری کی پہاڑیوں پر چڑھنے کا مزا ہے نہیں آتما سو جاتی ہے اور ہولے ہولے شریر بھی مردہ ہو جاتا ہے، تبھی تو

کبھی .....

دوسرے کا ہاتھ لگے، تو شریر اور آتما دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں، شادی شدہ جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے اگر عورت میکے ہی جاتی رہے یا مرد دورے پر چڑھا رہے، کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتا ہو..... تب بھی تبدیلی پرکرتی کا اصول ہے ..... سدا گرمی نہیں رہتی نہ سردی رہتی ہے ..... شکل پکش کی رات کا اپنا جادو ہے اور کرشن پکش کی رات کا اپنا..... سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی، پھر رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں، مور ہیں..... ان جانے ان گنت۔

شادی بہت اچھی چیز ہے لیکن کیا ایسا سمے نہیں آئے گا اگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے! یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہیں۔ اس چھت کے نیچے تم دونوں رہو گے، یہاں جو سنتان پیدا ہو گی، آدمی کی ہی ہو گی، مرد باہر کام پر جایا کرے گا، عورت گھر سنبھالے گی اور بس..... ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ لیکن بالو کی ماں میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے میں بیوی ہونے کی جگہ ان کی پریتما ہوتی تو کتنا خوش رہتی۔

ساری رات میں نے جاگ کر کاٹی، ساری رات میں سولی پر ٹنگی رہی، جب بھور ہوئی تو یہ چلے آئے، میں لپک کر دروازے کی طرف گئی، لیکن انہیں مجھ سے بات تھوڑے کرنی تھی، میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھئی، تو بھی کوئی ہے، باہر جاتے والے کا کیا ہے، ہزار روپ دیکھ کر آتا ہے۔ ہم ہی گھر میں ایک دوسرے کا منہ تاکا کرتی ہیں اور پڑے

پڑے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں، ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار، کھاؤ تو گرم ارنڈی کا سوداگر! ہونہہ...... پگڑی تو دیکھو، کیسے بیچ کے بیچ گلے میں پڑی رہتی ہے، جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منہ پر اکٹن کے کوٹلے کا برادہ پڑا ہے...... ہم ددت معلوم ہوتا ہے...... کمرے میں اور کسی کو جانے کی ہمت نہیں تھی، سوا دوا کے...... دوا گئیں، تو ان سے بولے "دوا جی! اسے کچھ کچی لسی کا گلاس بنا دے"

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی لسی بنانے، وہی صدیوں کی عادت، پل بھر میں تھوڑے چلی جاتی ہے رہیں نے جی میں کہا، بڑا آیا ہے حکم چلانے، جیسے میں کوئی لونڈی باندی ہوں ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں، حکم کی غلام لیکن میں نے جلدی سے کچی لسی بنا ڈالی، روپو ابھی جاگی تھی، ایک کر یو باہر نکلی تو گلاس سے ٹکرائی، لسی سے میرے کپڑے تر ہو گئے...... پھر جو بچی تھی بھیج دی۔

میں تم سے سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں! رات تک باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں نکلے آپس ہی میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ میں نے سوچ لیا، یا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی کی قسمت بنا سکتی ہے اور بگاڑ سکتی ہے۔ ہمارے دیش کی ارنڈی، توریا اور مونگ پھلی! ان میں وہ طاقت ہے۔ جو کسی دوسرے دیش کی دودھ ملائی میں نہیں۔ کسان ہل جوتتے ہیں...... بیج بوتے ہیں، کارخانے میں مزدور کام کرتے ہیں لیکن ان کی قسمت کا فیصلہ ان کر دن میں

بیٹھے بیٹھے وہ لوگ کر ڈالتے ہیں جو ہل چلانے میں نہیں، بولنے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی، باہر آئیں تو آج ان سے دو باتیں کروں اور کہوں پیسے کے پجاریو! ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی، جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے اور آگے چل دیتی ہے۔ دیکھو تو تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مہریں، سونے، چاندی، ہیرے جواہر کی کان میں تم نے ہم سب کو بندی بنا رکھا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں، ہیرے جواہر تو نہیں کھا سکتیں۔

وہ نکلے۔۔۔۔ باپ اور دونوں بیٹے۔۔۔۔۔۔ نہ چہرے پر خوشی، نہ دکھ اور پھر گھر سے باہر چل دیئے۔ ہم عورتیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔ سوچنے لگیں، آج ادہر میں کچھ کالا کالا ہے؛ دیدا آئیں اور بولیں "ارنڈی میں دس بارہ لاکھ کا گھاٹا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچہری کھلے گی تو داخل کر دیں گے۔"

دیوالہ۔۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو بالیہ کی ماں؛ تمہارے لیے دیوالہ مر جانے کی بات ہے، ان سیٹھوں کے لیے نہیں۔ یہ تو جتنے دیوالے نکالیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے ہر دیوالے میں یہ کچھ ادپر نیچے کر جاتے ہیں جس سے لاکھ دو لاکھ کا منافع ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا۔

رات بھر یہ مرد لوگ نہ آئے؛ دن بھر کچہری میں رہے، شام کو میں اسی نجارچے میں بیٹھی تھی، سامنے اپنے سسر کو دیکھا، کمر کی طنابیں ڈھیلی کرتے

ہوئے، میرے جیٹھ کی موٹے شیشے والی عینک ناک کی چونچ پر آ گئی تھی، اور منہ پر ٹھوڑی اور کا لک پت گئی تھی۔

دو سال تک انہوں نے روپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بیچاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا۔ اشارے میں سب کہہ دیا، لیکن انہوں نے میری نہ مانی۔ کوئی دھنی گھر دیکھنے میں وقت بے کار گیا۔

روپو نے اتنے عرصے میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی مشکی پھوڑ نظر آتا تھا، کب تک گلی محلے کی نظروں سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی، آخر میں ان تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپو کو خوب پیٹا، چھڑانے میں مجھے بھی پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

روپو کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا، میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی تو رو لیتی، باہر آتی تو رو لیتی۔ میں نے ساس کی خوشامدیں کیں، وڈل کے سامنے ہاتھ رگڑا اور کہا، کیا یہ ضروری ہے، اچھا سا لڑکا دیکھو جو کھاتا کماتا ہو۔ باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری میں ہو لیکن وہ کسی ایسے کی کھوج میں تھے، جو ان کی جات، برادری کا ہو، جس سے بیوپاری کا ناطہ بھی بڑھے، لیکن ایسا کوئی نہ تھا، تھا بھی تو بڑی ناک والا، بہت پیسے مانگتا تھا۔۔۔۔۔ لاکھ دو لاکھ کی بات بھی نہیں، پانچ لاکھ۔

روپا کھل کھیلنے لگی۔ اس نے صاف کہہ دیا، بیاہ کروں گی تو اسی مشکی پھوڑ سے۔

مشکی پھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا، اور وہ آتش بازی کی دکان کا مالک تھا۔ آمدنی کوئی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن دیوالی کے ادھر ادھر اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ سال بھر کے لئے کافی ہو۔ خود تو شیتل داس تھا، پر کام ہوائی پٹاخے کا۔ اپنا من شیتل ہو یا

نہ ہو لیکن دوسرے کا مزور کر دیتا تھا۔۔۔۔ دیول نگر میں دو چار ہی بانکے تھے جن میں سے ایک، وہ بھی تھا۔۔۔۔ ہر کھیل تماشے میں آگے۔ راس لیلا کا بندوبست اسی کے سپرد۔۔۔۔ وہ مہابھارت کا کنس تھا، اور رامائن کا راون!

لیکن روپا اب اس سے نہ مل سکتی تھی۔ نہ اسے گوکل اشٹمی کے دن سانول داس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی، اور نہ رام لیلا دسہرے میں حصہ لینے کی چھٹی۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا۔ میرے من میں جانے کیا کہ اتنی کی لہر اٹھی۔ رشیو مندر جانے کے بہانے میں نے کپڑے وغیرہ پہنے اور چل گئی۔ شیتل کی دکان رادھا بازار اور رگھوناتھ بازار کے سنگم پر تھی جہاں مہابیر جی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھرا رہتا ہے۔ اور ہر آتے جاتے کو لگتا ہے۔ کام دھام پر آنے جانے والے لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں، زنجیروں کے ساتھ لٹکی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے ہیں اور چل دیتے ہیں۔ جا کر شیتل کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اس کی دکان پر کام کرتے تھے، وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا تھا، اور لڑکوں کو گالیاں دیتا تھا۔

دسہرے کے آس پاس کے دن تھے، اور شیتل داس سامنے ٹوکرے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھا۔ میگھ ناد بن چکا تھا۔ اب راون بنتے جا رہا تھا۔

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا "کیا چاہیے، پھلجھڑیاں"؟

میں نے کہا۔ "پھلجھڑی لینے نہیں آئی، پھلجھڑی دینے آئی ہوں"۔

وہ کچھ نہ سمجھا۔ دکان سے نیچے اتر آیا۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا۔ میں پرے منہ کر کے راون کے ڈھانچے کو دیکھنے لگی جس نے طبیلے کا تین چوتھائی حصہ گھیر رکھا تھا۔ دس

سر لگنے والے تھے اور اوپر گدھے کا سر لگنے سے پورا طبیلا گھر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شیتل کے سر کی طرف دیکھا جس پر ہر سال منکیاں پھوٹنے سے چھوٹے چھوٹے گھاؤ کے نشان پڑ گئے تھے، پھر مجھے جو کہنا تھا چپکے سے کہہ دیا۔ شیتل داس کا چہرہ چمک اٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلہا اُودل سنایا کرتے تھے اور جسے سن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں سے ایک تھا جو کھنجری بجاتا تھا اور وہ شیتل تھا چوں کہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے، اس لئے رد لپو انہیں دیکھ سکی تھی۔۔۔ شیتل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا، میں مسکرا دی،

گھر بھر میں کوئی بھی شیتل کو نہ پہچان سکا، نہ پڑوسیں اسے جان پائیں۔۔ کمبخت ایسا بہروپیہ تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی تے، جو اس کے ایک ایک پل کو جانتی تھی، ردلپو اندر بھاگنے لگی میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں بالو کی ماں! مجھے اس میں ذرا بھی شرم نہیں لگی اور نہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کوئی پاپ کیا ہے، الٹا ایسا جان پڑا جیسے کوئی بہت بڑا پُن کا کام کر رہی ہوں، ہمارے شاستری اِس طرف تھے۔۔۔ اور دادا، ساس، جیٹھانی، سسر، جیٹھ، یہ، وہ، سب دوسری طرف۔۔۔۔ میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا کہ ان کے شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ عورتوں میں سے ردلپو گم ہے اور مردوں میں سے شیتل، باقی بھاٹ تلسی جی میں سے کچھ پڑھتے رہے۔

جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اُٹھ کر گئی تو دیکھا، ردلپو اپنے

کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تاک رہی ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا، وہ کہاں گیا تو روپو نے بتایا پیچھے سیڑھیوں کے راستے میں غائب ہوگیا۔ میں سمجھی بس مل لیے دونوں، اور کوئی بات نہیں ہوئی مجھے کیا پتہ بات کہاں جا پہنچی۔

گھر کے مرد لوگ ہیڑھی پر سے چلے آئے، میں سچ کہتی ہوں، اس دن مجھے روپو کے بھیا برے نہ لگے، انہیں خود بہت تعجب ہوا کہ یہ آج اتنا پھلا کیوں رہی ہے، میں بہت خوش تھی، جیسے مجھے کچھ مل گیا ہے، مل بھی جاتا تو بابو کی ماں اپنے آدمی کے لیے میرے دل میں پیار کم ہو جاتا؛ بالکل نہیں، الٹے بڑھتا ہی، میں سوچتی، میں کیا کرائی ہوں، ان بیچاروں کو کیا معلوم؛ جو لوگ عورت کو خلقت نہیں سمجھتے، بیوپار جائیداد کی چیز سمجھتے ہیں جن کے دماغ میں بیاہ کا وہی پرانا و چار گھسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ انہیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ گھر بھر میں شور ہو اٹھا۔۔۔ روپو شیتل کے ساتھ بھاگ رہی تھی کر پکڑی گئی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے، روپو سے الٹے سیدھے سوال کیے جا رہے تھے، لیکن اس نے ایک ہی چپ لگا رکھی تھی، وہ ڈھیٹ بن گئی تھی، اس کے تیور کچھ ایسے تھے کہ کرلو جو میرا کرنا ہے میں تو وہی کروں گی جو میرے دل میں ہے۔

ایک بات اچھی ہوئی جو شیتل نکل چکا تھا، اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلا۔

ایک سب کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، اتفاق سے دوسرے ہی دن گھر کے نائی نے بالا گھاٹ میں ایک رشتے کا پتہ دیا۔ ایسے سیٹھ کا پتہ دیا،

جس کے چھ دیوالے نکل چکے تھے، اور جو نوٹوں کا بیوپار کرتا تھا ۔۔۔ سب کچھ جلد ہی طے ہو گیا ۔۔۔ روپو کو منانے کا کام مجھے سونپا گیا۔ روپو کچھ مانی کچھ نہ مانی اور کچھ دنوں میں برات دروازے پر آ گئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ ٹیٹل سے کچھ نہیں تو دس گنا سندر تھا، یہ لمبا چوڑا تندرست، میں روپو کے پاس بھاگی گئی اور اسے سب بتا دیا ۔۔۔ روپو ۔۔۔ مسکرا دی، ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ میں تو ناچ اٹھی جیسے روپو کی نہیں، میری شادی ہونے جا رہی ہے۔

تم نے وہ شادی تو دیکھی ہے۔ بالو کی ماں، جو دیول نگر میں یادگار رہے گی ان کے پتا نے وہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس کس نے نہیں کھایا؟ کون ٹیک لے کر نہیں گیا؟ ہمیں چھپڑ نے کو پوری بارات ملی، اور پھر وہ ۔۔۔ دلہن کا دولہا! وہ چہل پہل ہوئی، وہ شور مچا کہ بس ۔۔۔ بینڈ باجے گانے روشنیاں۔ میری جیٹھانی کے بچے خوش تھے، میں نے بلرام کو بلایا اور کہا، دیکھ ننھے! تیری بوا کی شادی ہو رہی ہے۔ اس بے چارے کو کیا پتہ، کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا اور کیا ہونے جا رہا ہے وہ تو خوش تھا، ہاتھ میں ایک بڑا سا لڈو تھامے، اس نے صرف اتنا کہا، میں بھی شادی کروں گا چاچی۔"

میں نے کہا کس سے؟

بولا "بوا سے۔"

"ہشت" دوا جو پاس کھڑی تھی۔ بولی۔

ڈولی گئی۔۔۔ وہ آتشبازی چھوٹی کے رام رام! پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان سے کہہ سنکے نشتیل کو دلوایا تھا اور وہ خود اپنے سامنے چکر چلوا رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے۔۔۔۔ پھر ڈولی گئی۔

کہیں مہینے دو مہینے کے بعد روپو آئی۔ اس کے چہرے پر رنگ ہی اور تھا لڑکے نے اُسے اور اُس نے لڑکے کو خوب پسند کیا تھا۔ روپو کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

اَب میں اس کے سامنے یہاں کے مٹکی پھوڑ کا نام بھی لیتی تو روپو خود ہی منہ پر انگلی رکھ لیتی۔ میں نے اس سے کہا۔۔۔ "روپو، دیکھا۔۔۔ میں نہ کہتی تھی"!

روپو بولی "اور تو کوئی بات نہیں بھابی، یہ مجھ سے پیار کرتے ہیں، پر دبو بہت ہیں۔ گھر میں کمانے والے۔۔۔۔ میرے سسر ہیں اور ان کے بڑے بھائی اس لیے ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے انہیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں۔

"اور وہ تمہارا۔۔۔" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"وہ تو کچھ نہیں چاہتے۔ بس۔۔۔۔" روپو نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ پھر بولی "بہت وہ کرو گی بھابی تو ماروں گی۔ ہاں"۔

میں مارے خوشی کے رو دی۔ لیکن کیا پتہ تھا ہمیشہ کے لیے رونا پڑ جائے گا۔۔۔ ہائے یہ مرد!۔۔۔ روپو چار مہینے سے یہاں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ وہ روپیہ مانگتے ہیں اور یہ دینے کو تیار نہیں۔ روپو نے ٹھیک ہی کہا تھا لڑکا دبو ہے۔۔۔ بات یہ ہے کہ اچھے روپ جوانی

سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک آدمی آزاد نہ ہو سب بیکار ہے۔"

ابھی کچھ مہینوں میں روپو آدھی سی گئی ہے، وہ بخار چڑھنے سے جی نیچے نہیں بھاگتی حالانکہ ہر دوسرے تیسرے روز اس دبلی نگری کا بانکا شتیل آتش باز، بیاہ کے گانے گاتا نکل جاتا ہے۔ کل سویرے میرے سسر آئے، بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اس نائی کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ رشتہ کرایا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے چاہے وہ ساری عمر یوں ہی بیٹھی رہے، ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، روپو کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا ہے۔"

※ ※ ※

ٹرمینس سے پرے

پنجاب میل چلی تو خاصی سست رفتاری سے پلیٹ فارم کے احاطے سے باہر نکلی ... دیر تک موہن جام کو اپنی نازک سی بیوی سومترا کا بدن ایک سادہ سی ہینڈلوم کی ساری میں لپٹا ہوا نظر آتا رہا۔ سومترا کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑی تھی جب کہ موہن ایک اسٹال کے برابر کھڑا آخری دم تک اپنا رومال ہلاتا رہا۔

گاڑی چلنے سے پہلے سومترا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ الفاظ ہمیشہ کی طرح بیکار ہو گئے تھے۔ "پیچھے گھر کا خیال رکھنا" "ہوسٹل کی روٹی مت کھانا" "ہفتہ میں ایک ... نہیں دو بار خط ضرور لکھنا" یہ سب باتیں آنکھوں کی زبان کے سامنے گونگی ہو گئی تھیں، اور انہوں نے موہن جام ایسے آدمی کے دل کو بھی گداز کر دیا تھا۔ پھر بیوی الگ ہونے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں کون کی تائید سی مانگتی گئی ہے۔ اس وقت تو کوئی جھوٹ بھی بدل دے لیکن کچھ لوگ ... موہن نے کچھ نہ کہا ... وہ پہلے تیز تیز اور پھر آہستہ آہستہ رومال ہلاتا رہا۔ یہ حرکت ایک رسم بن چکی ہے لیکن اچھی معلوم ہوئی تھی۔ دل کہاں، کیوں اور کس کے لیے دھڑک رہا ہے؟ یہ تو دکھائی نہیں دیتا البتہ رومال نظروں کے دھندلکے میں حل ہونے تک برابر اس آدمی کو دکھائی دیتا رہتا ہے، جو ... رہ جارہا ہو۔

یہ سفر کی بکواس ریس تو جب کبھی کہیں جانے لگتا ہوں میری طبیعت گرسی جاتی
ہے، اسٹیشن پہ ہجوم، محض ہجوم کی وجہ سے آدمی تنہا رہ جاتا ہے۔ پھر آگے
جانے کے لیے گاڑی تھوڑا پیچھے ہٹتی ہے۔ پھر کوئی سیٹی، کوئی آواز: ارے
ارے، گاڑی چھوٹ گئی، میرا سامان رہ گیا" آخر... کوئی کسی کا نہیں...
یہ دنیا... جب ایک بار تو جی چاہتا ہے آدمی ٹکٹ وکٹ لوٹا دے اور گھر
جا کر مزے سے بیٹھ جائے چاہے پھر بیوی سے لڑے ہی،

زندگی کی فتح مندی یہی ہے کہ اداسی کے سائے میں بھی کہیں خوشی کے
جذبے رینگتے رہیں اور گاڑی کے چھوٹتے ہی لپک کر سامنے آ جائیں اور ان
کی روشنی میں اداسیاں غائب ہو جائیں۔ کبھی جس کے ساتھ پروگرام بنتے تھے
اب اس کے بغیر بننے لگیں۔ موہن نے ایک گہرا سانس لیا۔ "چلو دو مہینے کے
لیے چھٹی۔ کچھ چیزوں کا نہ ہونا ہی ایک طرح کا ہونا ہے۔ سومترا لوٹے گی تو ایک
بار اسے بھی پتہ چل چکا ہوگا میرے بغیر زندگی کے کیا معنی ہیں؟ پھر سے
غارت کرنے کے لیے اس کی صحت بھی اچھی ہو چکی ہو گی، پھر کیسے لپٹے گی۔
الٹا مجھ سے کہے گی... تو کہاں چلی گئی تھی موہنی"!

موہن وکٹوریہ ٹرمنس کے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لیے مڑا تو الٹی
طرف سے کوئی گاڑی پلیٹ فارم پہ آ رہی تھی۔ موہن چونک گیا... اسے یوں
لگا جیسے سومترا اس گاڑی سے گئی اور اس سے لوٹ آئی ہے۔ جبھی اس نے ایک
موٹی عورت کو کمپارٹمنٹ کے دروازے میں پھنسے ہوئے دیکھا، مسکرایا اور
چل پڑا۔ اسے ریڈیو کلب جانا تھا، تاش کے کچھ مداریوں کے ساتھ فلاش

کھیلنے کے لیے جہاں بیچ بیچ میں کبھی کبھی پان کی بیگم زندہ ہو جایا کرتی تھی اور سمندر سے آنے والے جھکڑ میں اس کی عنابی ساری کا پلو کسی نہ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا۔ پلو کے ہٹائے جانے تک ساری میں لپٹے ہوئے ایک وجود کے بجائے دو کا احساس ہونے لگتا۔۔۔

موہن جا رہا ہے۔ ان جلتے میں گھر اور کار کی چابیاں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ گھوم رہی تھیں۔ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا جس سے وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ٹٹول رہا تھا تبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

"اچی!" وہ رکتے ہوئے بولا۔

موہن اچلا کو جانتا تھا لیکن اتنا بھی نہیں۔ اچلا کے شوہر رام گدکری کو وہ شاید زندگی میں ایک آدھ بار ہی ملا ہوگا۔ لیکن اچلا سے اکثر مشاعروں میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں وہ اپنی ایک اوباش سی سہیلی۔۔۔ دیپی۔۔۔ کے ساتھ ویجی ٹیرین کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ نمستے نمستے، کے علاوہ موہن جام اور اچلا گدکری کے بیچ آٹھ دس نہیں تو بارہ پندرہ فقرے ہوئے ہوں گے جن سے پتا چلا تو صرف اتنا کہ وہ بھی کولابہ میں رہتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ موہن کف پریڈ کے ایک اچھے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور اچلا کاز وے پر کی ایک پرانی بلڈنگ میں رہتی تھی۔

شاید موہن اسے اچی کے نام سے نہ پکارتا تھا لیکن دیپی نے موہن کا اس سے تعارف ہی اس نام سے کرایا تھا۔ دیپی کو موہن اچھی طرح سے جانتا تھا۔ دیپی سمجھتی بھی تھی، پانی مصری کے لیے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس پر بھی وہ چھوٹتے ہی

کسی بھی پرائے مرد سے گھل مل جاتی تھی، اس کی آزاد زندگی کچھ ایسا ہی شربت تھی جو زندگی کی ٹھلیا میں رات بھر پڑا رہتا ہے، صبح تک پانی اپنی ہی تبخیر سے اڑ جاتا ہے اور پھر سے مسری کی ڈلیا ٹھلیا کی تہہ میں دکھائی دینے لگتی ہیں، پہلے سے بھی صاف شفاف، چمکیلی، نوکیلی،،،

موہن کے پکارنے پر اچلا نے تھوڑا گھوم کر دیکھا اور صرف اتنا کہا۔ "مو"۔ اور کچھ دیر بعد بولی۔۔۔ "ہن"۔

اور پھر اس نے اپنی ساری کے پلو سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھ ڈالی۔ اب وہ مسکرا رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایکا ایکی کسی نے کوئی سنہرا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ تھوڑا موہن کے قریب آتے ہوئے بولی۔۔۔۔۔ "آپ؟ یہاں کیسے"؟۔

"بیوی کو چھوڑنے آیا تھا" موہن نے جواب دیا۔ "کشمیر جا رہی ہیں، بچے کی چھٹیاں ہو گئیں نا۔۔۔ آپ"؟

"میں"؟ اور اچلا ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر اسی دم چپ بھی ہو گئی، کچھ شرماتے ہوئے بولی۔ "میں ان کو چھوڑنے آئی تھی"۔

"اوہ" اور موہن بھی ہنس دیا ایک نظر اچلا پہ ڈالنے کے بعد وہ دوسری گاڑی کے انجن کی طرف دیکھنے لگا جس میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر اچلا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کہاں گئے گدگری صاحب"؟

"دلی"۔

"کب آئیں گے"؟

"یہی کوئی ہفتہ دس دن میں"۔۔۔اچلا نے کہا۔۔۔کوئی کانفرنس ہو رہی ہے"۔

"شاید زیادہ دن بھی لگ جائیں"؟

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔"

اور اچلا اپنے بالوں کو سنوارنے لگی جو پہلے ہی سنورے ہوئے تھے، صرف ان میں ایک پن ڈھیلا ہو کر قدرے اوپر اٹھ آیا تھا، جسے اچلا نے اپنے مومی ہاتھوں سے دبا دیا۔ جبھی اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ دیر تک اوپر اٹھے رہے ہیں، موہن کی نظر اس کے پورے بدن کا طواف کرتے ہوئے ایک پل بہت دیر اس کے بدن کے اس حصہ میں جا رکی تھی، جو چولی اور ساری کے درمیان ہوتا ہے ایکا ایکی ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس نے ساری سے اپنے بدن کے ننگے حصوں کو ڈھک لیا۔

موہن نے سوچا، بدن کے اس حصے کو انگریزی میں مڈرف کہتے ہیں اور شہد کی مکھی کی طرح اسٹیشن سے باہر نکلنے تک یہ لفظ اس کے دماغ میں بھنبھناتا رہا، مڈرف، مڈرف۔۔۔۔ مڈرف۔۔۔۔ مڈرف۔۔

اور موہن نے اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی نہ کی، سب بیکار تھا، موہن جانتا تھا مکھی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بار بار اڑ کر پھر آ بیٹھتی ہے جہاں سے اڑائی تھی بھلا کر اسے ہٹانے کی کوشش کریں تو ناک لوٹ جاتی ہے، مکھی اڑ جاتی ہے۔

باہر گرمی بہت چکنی چکنی، گیلی گیلی تھی، بلاؤز سینوں سے چپک رہے تھے اور اس سونے کی طرح خوبصورت، تنگ رہے تھے، جو کانوں کو پھاڑے ڈالتا

ہے۔ پسینے کے قطرے ساریوں اور پتلونوں کے اندر ہی اندر پنڈلیوں پر ٹپکتے اور جونک کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اسٹیشن کا چلتا پھرتا پیاؤ پیچھے رہ گیا تھا اور یہ اسی کی وجہ سے تھا جو پیاس اور بھی تیکھی ہو رہی تھی۔ باہر ہال کے اندر ایک کونے میں تھوڑی جگہ ٹھنڈی تھی جہاں اوپر چھت پہ دو پروں والا پنکھا سست سی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڈھا منہ کھولے ہوئے سو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لاش شناخت کے لیے شہر کے مردہ خانے میں پڑی ہے۔

موہن اور اچلا نے دو چار باتیں کیں اور اس کے بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے ذہن میں کوئی موضوع ڈھونڈ رہے تھے، جو زیادہ سوچنے کی وجہ سے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔ اچلا دو قدم آگے جا رہی تھی اور موہن پیچھے جبھی اچلا میں اپنے بدن کے ان خطوں کا شعور عود کر آیا جنہیں عورت بدصورت سمجھتی ہے اور مرد خوبصورت سمجھتے ہیں اور ہر عورت انہیں مفت دکھانا نہیں چاہتی۔ وہ یا پیسے مانگتی ہے اور یا محنت۔۔۔ محبت جو ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور جسے کپڑے پہنا دیئے جائیں تو وہ محبت نہیں رہتی۔ اچلا نے اپنے جسم کے پچھلے حصے پہ ساری کھینچ لی۔۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نظروں کی برچھیاں پیچھے سے اس کے بدن کے ہر پور پہ لگ رہی ہیں۔

"اچھا، موہن جی" وہ مڑتے ہوئے بولی "میں اب جاؤں گی"

"کیسے جائیں گی؟" موہن نے پوچھا۔

"ایسے" اور اچلا نے تھوڑا چل کے دکھایا اور پھر دونوں کھلکھلا کے ہنس

دیئے ، ، ، ، اتنی سی بات میں دونوں کے بیچ ایک یگانگت پیدا ہو گئی تھی ، آخر موہن نے کہا : میرا مطلب ہے آپ گاڑی نہیں لائیں ،

اچلا نے سر ہلاتے ہوئے کہا : مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی ۔"

" میں جو ہوں" موہن نے کہا ۔ آج تھوڑی دیر کے لیے مجھے ہی اپنا ڈرائیور سمجھ لیجئے ۔"

" جی ! اچلا بولی ۔ نہیں نہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؛ میں بس پہ چلی جاؤں گی آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ۔"

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں" ؛ کا جملہ ہی ایسا ہے جس میں کوئی کسی کو تکلیف دینا چاہتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کی گنجائش بھی رکھتا ہے ۔ گویا اسے ٹٹولتا ہے ۔ تم میرے ساتھ کس حد تک بڑھ سکو گے ؛ یہ جملہ مرد کہے تو ایک عام سی بات ہے ۔ ۔ ۔ مگر عورت کہے تو ایک خاص بات ہو جاتی ہے ۔ یہ عورتوں کے فقرے ، جیسے جھوٹے کہیں کے ۔ "مر گئی میں" وغیرہ ۔

اس میں تکلیف کی کیا بات ہے" ؛ موہن بولا " میں گھر ہی تو جا رہا ہوں راستے میں آپ کو چھوڑ دوں گا ،

گویا ریڈیو کلب موہن کے دماغ سے اپنے آپ براڈ کاسٹ ہو گئی تھی ۔

تھوڑی حیص بیص کے بعد اچلا گری موہن جام کی گاڑی میں بیٹھ گئی ،

گاڑی فریئر روڈ کی طرف سے نکلی ، کراسنگ پر پولیس مین نے الٹا ہاتھ دیا ہوا تھا جس کی وجہ سے موہن کو گاڑی روکنی پڑی ، موہن پولیس مین کے الٹے ہاتھ پہ ہمیشہ جھلایا اور منہ میں گالیاں منمنایا کرتا تھا ۔ لیکن اب کے وہی ہاتھ اسے

مسیح کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔

دیبی کیسی ہے"؟ موہن نے آخر گفتگو کا موضوع ڈھونڈھ ہی لیا۔

اچلا نے جواب دیا۔"دیسی ہی ہے"

"کیا مطلب"؟ موہن نے چونکتے ہوئے کہا۔"میں تو سمجھتا ہوں دن ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔"

"میں نے کب کہا بری ہے" اچلا بولی اور ہنسنے لگی۔

موہن اچلا کے جال میں آ گیا تھا اور اب یوں ہی بچ نکلنے کے لئے اِدھر اُدھر اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پہ چلے آئے۔ اچلا اس سے دور ہٹ کر دروازے سے لگی بیٹھی تھی جیسے کپڑا بھی چھو گیا تو کوئی رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے موہن بولا"آپ مجھ سے اتنی دور کیوں بیٹھی ہو"؟

"یونہی"۔ اچلا نے کہا اور مشکل سے ایک بھر موہن کی طرف سرک آئی"میں نے سوچا آپ کو گیر بدلنے میں تکلیف نہ ہو۔"

"پھر وہی۔۔۔تکلیف"!

جب تک پولیس مین نے ہاتھ دے دیا تھا۔ لیکن موہن کی کار بدستور کھڑی تھی۔ پولیس مین کی سیٹیاں اور پچھلی کاروں کے ہارن ایک ساتھ سنائی دینے لگے۔ موہن نے جلدی سے گاڑی کو گیر میں ڈالا اور گھبراہٹ میں فوراً پیر کلچ پر سے ہٹا لیا گاڑی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی بند ہوتے ہوتے رکی۔ پولیس مین سے کچھ آگے نکلی تو اچلا بولی"کیا آپ گاڑی ایسے ہی چلاتے ہیں۔"؟

"نہیں" موہن نے کہا۔ "میں تو اتنے پیار سے چلاتا ہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔
مگر آج ۔۔۔۔"
"آج کیا ہوا؟"
"آپ ہولی ہیں ۔۔۔ اور کیا ہوگا؟"

موہن اور اپلا ٹاؤن ہال کے سامنے سے جا رہے تھے۔ نہ معلوم کیوں موہن کا جی چاہ رہا تھا، آج کوئی ایسی ڈنٹ ہو جائے، ایک بس تیزی سے گزری اور موہن کو اپنے اندر اس عجیب سی خواہش کو دبانا پڑا۔ سامنے ہال کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں پر سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے موہن نے کہا۔
"کتنا اچھا ہے۔"
"بہت اچھا ہے۔"

انفنسٹن سرکل کی طرف سے جوانی کے عالم میں بپھری ہوئی ایک بے حد خوبصورت لڑکی ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے رجسٹرار کے دفتر کی طرف جا رہی تھی، شاید اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ کسی اندرونی تمازت سے تمتمایا ہوا تھا۔ اپلا نے موہن سے پوچھا۔ "آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہے۔"
"اچھی"

اور موہن نے "اچھی" کچھ اس انداز سے کہا کہ اچھی اور اپلا میں کوئی فرق نہ رہا۔ اپلا خوش ہوگئی۔ کوئی ایسا کر سکتا تھا؟ وہ خوش ہوگئی۔ یونہی دکھا دے کے لیے بولی۔ "میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں۔"

موہن نے ایک نظر اچلا کی طرف دیکھا اور سب کچھ کہہ دیا جو وہ یوں نہ کہہ سکتا تھا۔

کاما ہال، لوائین گیٹ گزر گئے اور موہن کی گاڑی ریگل سینما کے پاس سے نکل رہی تھی سامنے کا بت ممی موہنا تھا۔ ریگل میں تصویر اچھی تھی۔ پھر گرینڈ بازار میں موہنا تھا، پھیلیرے کی دکان اچھی تھی۔ گاڑی کا تدسے پر سیہ سدن کے سامنے رک گئی جہاں اچلا رہتی ہے۔

اچلا نے چھلکتی ہوئی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا سوائے سامنے کے ٹیلر ماسٹر کے، جو اچلا کا باپ جانتا تھا کسی دوسرے نے اچلا کو موہن کی کار سے اترتے نہ دیکھا تھا دیکھتا بھی تو اسے کیا پرواہ تھی؛ موہن کو کیا حیا تھی۔ اس پر بھی ایک دم دروازہ کھول کر اچلا گاڑی سے اتر گئی، تھوڑا ٹھٹک کر کہا۔ اچھا موہن جی، بہت بہت شکریہ اور چل دی۔

موہن بدستور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک ٹانگ اندر تھی اور دوسری کھلے ہوئے دروازے سے باہر۔ وہ اتر کر اچلا کے لئے دروازہ کھولنا چاہتا تھا لیکن اس نے موقع ہی نہ دیا۔ کچھ دور جا کر اچلا کو جیسے کچھ یاد آیا، وہ تھوڑا رکی اور جو کہا بھی تو صرف اس لئے کہ وہ اسے نہ کہنا چاہتی تھی اور اپنے اندر کسی فقرے کو روکے ہوئے تھی۔ لیکن بعض اوقات جسم روح سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

"کبھی آئیے گا، موہن جی"

اور موہن کے جواب کا انتظار کئے بغیر اچلا گھر کی طرف لپک گئی۔ پیچھے جلیبے

موہن ہوا سے باتیں کر رہا تھا "آؤں گا آؤں گا، کیوں نہیں"؟

اچلا کا خیال تھا، موہن اتنا تو سمجھدار ہوگا ہی، ان کے گھر پہ نہ ہونے پر کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے، یہ دعوت تو صرف تکلف کی بات ہے"؟

موہن واقعی سمجھدار تھا، ورنہ وہ دوسرے ہی دن اچلا کے ہاں پہنچ جاتا جب کہ اپنے پتی رام گدکری کا اچلا کے دماغ میں تصور بھی موجود نہ تھا۔

موہن جام نے گھنٹی کچھ اس زور سے بجائی کہ اچلا گھبرا کر بھاگی چلی آئی جیسے رام اگلے روز ہی کسی پشت بوان پر بیٹھ کر آ گئے۔ ابھی تو اسے کپڑے بھی ٹھیک کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ باہر نکالا اور پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹ گئی، اپنے آپ میں سمٹ گئی اور بولی ذرا رک جایئے ......

اور وہ اندر بھاگ گئی۔

موہن میں اتنی تاب ہی کہاں تھی، وہ تو پیچھے ہی سے یوں آیا تھا جیسے فٹ گیئر میں لگا ہو۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا، اگلے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم میں تھا۔ اس کے تو سر پہ بھی جیسے کوئی آنکھ تھی جس سے چھت تک دکھائی دے رہا تھا، جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے اچلا کا بیڈ روم صاف دکھائی دیتا تھا۔

عورت اور گھر میں فرق ہی کیا ہے؟ کم سے کم پوچھ تو لینا چاہیے، آخر اتنا بھی کیا! لیکن موہن پیر سے سر تک امڈا ہوا تھا جیسے اچلا بیڈ روم کے کھلے دروازے میں سے سمٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، دونوں بالکل ایسے

تھے جیسے جذبات اور خیالات، آنکھوں اور جسم کے اعتبار سے بھگوان نے انہیں بنایا تھا۔ اچلا پلنگ کی پائنتی پر سے ساری اٹھاکر جلدی جلدی میں اسے نیچے کے کپڑوں میں لپیٹ رہی تھی۔

"معاف کیجیے۔۔۔۔" موہن جام نے وہیں سے کہا۔

اور وہیں سے ویسا ہی، اچلا نے جواب دیا "کوئی بات نہیں۔"

ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے بیچ ایک چھوٹی جگہ تھی جہاں شیشے کی ایک کیبنٹ کے اندر شوجی بھولے ناتھ کی تصویر ٹنگی تھی اور اس پہ ایک باسی سا ہار لٹک رہا تھا۔ یہی نہیں، ساتھ کنواری مریم کی شبیہہ بھی تھی اور گرو نانک کی بھی۔ اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پہ لیڈا ننگی کھڑی تھی اور راج ہنس اسے اپنے پروں میں دبائے چونچ اٹھائے توشہ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحہ میں موہن جام نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھ لی تھیں۔ سومترا دیکھ لی تھی۔ اور دیپی دیکھ لی تھی، زانا اگیورو دیکھ لی تھی، کوئی اور بھی دیکھ لی تھی۔ اور رادھا دیکھ لی تھی جو موہن کی سگی بہن تھی۔ اور پاپیل میں اپنے ولونگ ماسٹر میاں کے ساتھ رہتی تھی۔

موہن نے عورت کو ہمیشہ مایا کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔ اچھا اور برا، گناہ اور ثواب، کبھی خوبصورت کبھی بدصورت طریقے سے آپس میں گھلے ملے ہوئے تھے۔ پھر عورت کپڑوں میں بھری ہوئی دکھائی دیتی وہ دبلی نکلتی اور دبلی دکھائی دینے والی بھری

ہوئی ... ایسے ہی تو پایا کہتے ہیں یا لیلا ۔ مثلاً: ایسی تندرست عورت جسے دیکھتے ہی گردے میں درد ہونے لگے، اس سے ڈرنا بیکار کی بات ہے اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے الجھنے میں اتنا بھی نفع نہیں ہوتا جتنا کسی مزدور کو بیس سیر لکڑی کاٹنے سے ہوتا ہے ۔

پایا جس کے بارے میں سوچیں کہ یہ رام ہوئی، وہی اپنی حکمت ناکام ہوئی اور جس کے بارے میں کہیں یہ ہاتھ نہ آئے گی، آخر وہی گردن دبائے گی ۔ اور پایا کیا ہوتی ہے؟ البتہ ایک اور پایا ہوتی ہے جو پا لینے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی ۔ اس دنیا سے جاتے سمے یوں معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی کو نہ پایا، آپ کو سب نے پا لیا ۔

جب ہی ساری اور بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے اچی ڈرائنگ روم میں چلی آئی، وہ کتنی حسین لگ رہی تھی، کیا صرف اس لئے کہ وہ دوسری عورت تھی ۔ نہیں نہیں وہ پہلی ہوتی تو بھی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی ۔ اس میں کوئی بات تھی، جو کسی دوسری میں نہ تھی ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ایسا تو پھر ہر ایک کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، مگر اس کی بھوؤں پہ بچپن کی چوٹ کی وجہ سے ہلکی سی خراش تھی جس نے بالوں کی تحریر دن کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا، اور وہ خراش ہی تھی جنہیں چوم چوم لینے کو جی چاہتا تھا ۔

موہن کے قریب آتے ہوئے پھر سے ہاتھ اوپر اٹھا کر اچی نے سامنے سے اپنے بال تھوڑے سے اوپر اٹھا دیئے ۔ وہ بالوں کا ایک Tiara سا بن گیا تھا ۔ سونے اور ہیرے کے "تاج جس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ وہ اپنی ہی ساری

کے پلو سے اپنے آپ کو ہوا دیتے ہوئے بولی۔ "اُف! آج کتنی گرمی ہے۔"

اور پھر ہاتھ دائیں طرف بڑھاتے ہوئے دیوار پر پنکھے کے سوئچ کو دبا دیا۔ جب ہی موہن بولا۔ "میں سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے تھے، آپ؟" اچلا نے ایک منتظر نگاہ سے موہن کی طرف دیکھا۔

"یہی۔" موہن نے کہا۔ "کہ آج گرمی کتنی ہے۔ اُف!"

اور جب پنکھے سے ہوا کا پہلا جھونکا آیا تو موہن اور اچلا تسکین کا سانس لیتے ہوئے آمنے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ کتنا ظلم تھا! وہ ایک دوسرے کے پاس بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ سب کچھ کتنا غیر فطری معلوم ہو رہا تھا یہ ٹھیک بھی تھا۔ اگر دنیا بھر کے مرد عورت فطری زندگی گذارنے لگیں تو کیا ہو؟ لیکن۔ مرد اور عورت دونوں نامکمل ہیں۔ ان کی تکمیل...! جسموں کو ماریئے گولی روحوں کو پا لینے کے لیے بھی کیا ایلا سکا سے ہو کر آنا پڑے گا۔

ایسے ہی تکلف میں لوگ ایک دوسرے سے میلوں دور چلے جاتے ہیں، پھر عجیب طرح کی کشمکش شروع ہوتی ہے۔ جان نہ پہچان اور آتے ہی پکڑ لیا! اور یہ بھی پہلے کیوں نہ بلایا؟ کیا سمجھتے ہو، محبت کے کھیل میں تو پہلی نظر پہلا ہی جملہ اور پہلی ہی حرکت اپنے پہ چھا جاتے ہیں! ایک دن دیبی ایک پینٹر کے بارے میں جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے، کہہ رہی تھی، میں تو اپنا سب کچھ اس پہ لٹا دیتی، لیکن چھوتے ہی کیسے بھونڈے طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سب چھوٹے بڑے راز جاننے کی کوشش کرنے لگا۔

ایسے تھوڑی ہوتا ہے، میں نے اسی بھونڈے طریقے سے اسے روک دیا۔ اب میں اس کے پیچھے بھاگ رہی ہوں اور وہ کسی ضد میں پڑ گیا ہے، جانے سمے کا وہ کون سا انتش تھا جس میں۔۔۔ سنا ہے وہ آگرے پاڑے میں کسی رنڈی کے پاس جاتا ہے۔"

اچلا کے کوئی بچہ نہ تھا، پانچ چھ سال کی شادی کے باوجود اس کی ماتا ویسے ہی دبل پڑی تھی۔ البتہ پندرہ سولہ برس کی ایک نوکرانی تھی، جو اچی کے اشارے پر چائے بنا کر لے آئی، پھر ایک پلیٹ میں ختائیاں بھی لائی جو اچلا نے گھر میں بنائی تھیں اور جن پہ پستہ فراوانی سے بکھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے موہن کو کبھی دیکھا تو نہیں، کے انداز میں دیکھا اور پھر رسوئی میں کام کرنے کے لیے چلی گئی۔

"لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے۔" موہن نے ختائی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اور اچلا نے اندر کی طرف دیکھا۔ "پر جوان لڑکیوں کو گھر میں رکھنا نہیں چاہیے۔"

"کیوں رکھنا نہیں چاہیے؟"

"کیا بتاؤں؟" اور اچلا ہنس دی۔ "روز کوئی نیا البیلا دروازے پر موجود ہوتا ہے۔"

اور پھر دونوں مل کر ہنسے۔ موہن نے بات شروع کی۔ "میں بھی تو ہوں۔"

اچی کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ نگاہیں چراتے، چائے میں چمچ ہلاتے ہوئے وہ بولی۔ "آپ کی بات دوسری ہے۔ اور پھر ایکا ایکی "اب کے رام آئیں گے

تو میں اُنہیں آپ سے ملواؤں گی، بڑے مزے کے آدمی ہیں۔

موہن نے چھیڑا۔ اس کا مطلب ہے اس سے پہلے نہ آؤں "؟

"نہیں نہیں" اچلا نے گھبراتے ہوئے کہا، آپ جب جی چاہے آئیے"

"آپ کا اپنا گھر ہے"۔

پھر اچلا نے سوچا۔ وہ کیا کہہ گئی؛ عورت ہونا بھی ایک مصیبت ہے، کیوں وہ ہر وقت ڈرتی رہتی ہے؟ کیوں کہتی کچھ ہے، مطلب کچھ اور ہوتا ہے؟

اور اچلا نے رام گدکری کی باتیں شروع کر دیں، جیسے ان سے اچھا مرد کوئی اس دنیا میں نہیں۔ ایک رام ایودھیا میں پیدا ہوئے اور ایک اب بیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں، اور کولابا میں رہتے ہیں۔

موہن رام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کہ وہ سومترا کی باتیں کرے دونوں میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے جانے بوجھے بغیر، وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے، موہن نے بتایا، سومترا بڑی گریٹ عورت ہے، لیکن اس کی صحت کی خرابی نے پوری زندگی پر غم کی ایک چھاپ لگا دی ہے"۔

جب ہی نوکرانی ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی "بائی میں جاؤں"؟

"نہیں نہیں" اچلا نے موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، کپڑے دھوؤ جا کر دیکھتی نہیں غسل خانے کے پاس کتنا ڈھیر لگا ہے؟ چلو چلو۔۔۔"

اور نوکرانی منہ پھلائے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا

موہن بدستور سومترا کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ دس سال سے جس عورت نے تمہارا ساتھ دیا ہو اسے تم صرف اس لیے چھوڑ دو کہ وہ بیمار ہے! جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال تمہاری خدمت میں لگا دیئے اور جس کی صحت کی خرابی کے تم ذمہ دار ہو میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔

اور موہن کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے۔

اچلا کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس میں برسوں کی دبی ہوئی کوئی چیز ابل پڑی نہیں نہیں، موہن جی۔ وہ بولی۔ "ٹھیک ہو جائیں گی۔" اور بغیر موہن کے ایک دم پاس پہنچتے ہوئے اس نے ساری کے پلو سے موہن کی آنکھوں کو پونچھ دیا۔

موہن ایک قطعیت کے ساتھ اٹھا اور پھر بولا اچھا جی۔ میں چلوں گا۔

"بیٹھئے تو۔۔۔ کچھ دیر"۔ اچلا نے پھر ویسا ہی جملہ کہا۔

لیکن موہن نے انکار کر دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا مجھے ساڑھے گیارہ بجے اجوانی بیرپلز میں جانا ہے۔

اور موہن فریادی نظروں سے اچلا کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اچلا اٹھی، وہ مسکرا رہی تھی۔ بیڈروم میں جا کر اس نے اپنے سراپا کی طرف دیکھا، وہ کیسی لگ رہی تھی! اسے اپنا آپ اچھا لگا۔ پھر وہ نوکرانی کے پاس پہنچی۔

"تمہارا وہ جوشی نہیں آیا؟" اچلا نے کہا۔

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ زی بولی "وہ صاحب جو آئے تھے چلے گئے؟"

"ہاں" اچلا کو کتنی تسلی تھی۔

تم جارہی کے ساتھ بمبئی چلی جانا۔" اچی نے کہا۔ "تمہارے سب لڑکوں سے ایک وہی مجھے ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔"

اور روزی ایکا ایکی خوش ہو اٹھی۔

اچی سے موہن کی غالباً یہ پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ اب وہ ٹیلر ماسٹر اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی موہن کی کار میں آ بیٹھتی تھی اور دونوں شام کو ہوا خوری کے لیے نکل جاتے تھے۔

کر دیں۔ ایک چھٹی میں تو مذاق بھی کیا: اگر تم نہ آؤ گی تو میں کسی دوسری سے لو لگا لوں گا۔" اور اس نے سومترا کو بے فکر کر دیا۔

ایک شام بریج کے پاس سے ہوتی ہوئی گاڑی بیک بے کے پاس اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ اچلا نے کی مشق کر رہی ہے۔

موہن نے اچلا کا ہاتھ تھام لیا۔ مزاحمت تو ایک طرف، اس نے موہن کا ہاتھ دبا دیا اور دونوں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ حتیٰ کہ موہن کو کہنا پڑا۔ "گدکری کب آنے والے ہیں؟"

"یہی کوئی دو ایک دن میں۔"

"کانفرنس لمبی ہو گئی۔"

بھگوان جانے ۔۔۔ ان مردوں کا کیا پتا! کس سوتن کے سنگ راس رچا رہے ہوں۔"

"کیا بات کرتی ہو۔" موہن نے اچی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بھگوان رام

ہیں تمہارے لیے :

"بھگوان رام ہوتے تو سیتا کو ساتھ نہ لے جاتے ؟"

موہن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب کانفرنس میں تھوڑے جا سکتی ہو "

اور موہن نے اچی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اچی نے تھوڑی سی مزاحمت کی لیکن پھر جیسے اپنے آپ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یوں بھی کسی آسائش کی ضرورت تھی کیونکہ جب سے گاڑی بیک بے میں آ کر اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی، اس نے اندر ہی اندر کانپنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی نسوں کو کسی آرام کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر موہن کی چھاتی پہ رکھ دیا۔

موہن اچلا سے پیار کرنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی گاڑی کے پاس چلا آیا اور بولا "ناریل پانی "

" نہیں چاہیے"۔ موہن نے اچلا سے تھوڑا الگ ہوتے ہوئے کہا لیکن ناریل والے کو بدستور وہیں کھڑا پا کر وہ ایک دم جھلا اٹھا "ابے کہا نا نہیں نہیں چاہیے اور پھر جاتا ہے یا ۔۔ " اور موہن جیسے اسے مارنے کے لیے لپکا۔

اچلا نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا "کیا کر رہے ہو" کچھ گھبرا کے اور اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی "دیکھتے نہیں ہاتھ میں چھری ہے "

" ہوگی ہے"، موہن نے بے پروائی کے انداز میں کہا۔

ناریل والے نے اپنی مالاباری زبان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ کچھ دور پتھر کی دیوار پہ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے آواز دی "مجا کر بابو ۔۔۔ مجا کر ۔۔ "

موہن تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپلا سے کہنے لگا " گھر چلتے ہیں۔
" کس کے گھر ؟

" میرے ... تمہارے۔ دوزی کیا وہیں ہو گی ؟
نہیں ... وہ پکچر دیکھنے گئی ہے، اپنے جو ہن کے ساتھ ۔"
تو پھر ... ٹھیک ہے ... "
" نہیں نہیں ۔" وہ بولی " گھر پہ ہمیں کیا کرنا ہے "؛

دراصل اپلا کو گھر میں شیشے کا کیبنٹ اور اس میں لگی ہوئی تصویریں یاد آگئیں تھیں۔ وہ تو اپنے شوہر سے بھی پیار کرنے سے پہلے بیچ کا دروازہ بند کیا کرتی تھی اس کے بعد پتھر پہ بیٹھے ہوئے بے فکرے کی موجودگی کے احساس سے بے خبر ہو کر جب موہن نے اپلا کا منہ چوما تو اس میں پہلی سی خود سپردگی نہ رہی تھی " نہیں نہیں " اس نے خفیف سا کہا جو احتجاج تھا اور نہیں بھی۔ البتہ جب موہن نے ہاتھ بڑھا کر راچی کے چھوٹے بڑے راز معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بدک کر الگ ہو گئی، موہن کو برا سا لگا، اس نے کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد پھر ایک بھرپور حملہ سا کیا لیکن اپلا کسی نہایت ہی مضبوط قلعے میں محبوس ہو کر بیٹھی تھی، وہ شکایت کے لہجے میں بولی " نہیں نہیں " اتنا ہی بہت ہے۔

" بے وقوف نہ بنو راچی " موہن نے برافروختہ ہو کر کہا " پیار کا یہی مطلب تھوڑی ہوتا ہے "؛

جو ہوتا ہے وہ سمجھا دو "
" کیوں، بہن بھائی کا پیار نہیں ہوتا ؟

"ہوتا کیوں نہیں" موہن نے اپنی مردانہ حفت کو چھپاتے ہوئے کہا اور اسے اپنی بہن رادھا یاد آگئی جو پاریل میں رہتی تھی۔

"یہ رشتہ تو ہم ہمیشہ نہیں رکھ سکتے" اچی بولی۔ "ایک دو دن میں وہ آجائیں گے۔ چھ مہینے ڈیڑھ مہینے میں سومترا بہن بھی لوٹ آئیں گی۔

"ہوں"

"بہن بھائی کا پیار ہے جس میں کوئی ڈر نہیں، کوئی کھٹکا نہیں۔"

"ٹھیک ہے" موہن نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "آج سے میں نے تمہیں بہن کہا" اور موہن نے زناٹے سے گاڑی چلادی۔

اچی بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے موہن کا بایاں بازو پکڑ لیا اور شانے پر اپنے بالوں کا خوبصورت تاج رکھتے ہوئے بولی "تم تو روٹھ گئے۔"

"روٹھوں گا کیوں؟" موہن نے کہا "بھلا بھائی بہن سے روٹھ سکتا ہے۔"

اچلا نے جھٹکے سے اپنا سر موہن کے کاندھے سے ہٹالیا۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی سیٹھ سدن کے سامنے کھڑی تھی۔ آج دروازہ کھولنے کے لئے موہن نے ذرا بھی جھجک نہ کی۔۔۔ اچلا بے دلی سے اتری۔ سامنے کا ٹیلر ماسٹر غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور آس پاس کے کچھ لوگ بھی۔ لیکن اچلا کو جیسے کوئی ڈر نہ لگ رہا تھا۔ اس نے آج موہن کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ وہ بے حد متفکر تھی۔ ایسے وسوسے اور ڈر اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنہیں وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اسے ایک ڈر تھوڑے تھا۔ ہزاروں تھے جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور پہچاننا

ممکن نہ تھا۔

"آپ آؤ گے"؟ اس نے پوچھا۔

"آؤں گا، آؤں گا۔ کیوں نہیں" موہن نے کہا اور پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیا، جیسے کوئی بچے کو ڈرا تو سکتا ہے مگر ایک حد تک۔

اس کے بعد موہن "ٹاٹا" کہہ کر چلا گیا۔ اچلا جب گھر لوٹی تو کئی قسم کا بوجھ اس کے سر سے اتر چکا تھا۔

اگلے ہی روز گدگری چلے آئے۔

اچی انہیں اسٹیشن پہ لینے گئی تو دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کے شوہر نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔

"یہ کیا؟" اچلا نے پوچھا۔

"ایسے ہی۔" اس کے پتی نے ہنستے اور ایک نہایت ہی عاشقانہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "من کی موج"۔

اور پھر قلی کے سر پہ سوٹ کیس رکھواتے اچی کے پاس آتے ہوئے بولا، بری لگتی ہیں؟

"نہیں بری تو نہیں لگتیں مگر۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی اور ہی مرد کے ساتھ جا رہی ہوں"۔ اچلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رام گدگری نے چھیڑا۔ اچلا ہے نا۔ ایک ہی زندگی میں دو مرد دیکھ لئے۔

اس نے سوچا، اچی ہنسے گی اور اس لطیفے سے پورا لطف اٹھائے گی یا دھپ سے پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہے گی "شرم نہیں آتی"۔ لیکن اچلا نے کچھ بھی نہ کہا

اٹھا جیسے کسی فکر کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر سے گذر گئیں، ایک متجسس نگاہ سے اس نے رام کے چہرے پر دیکھا جو مونچھوں کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بیوقوف نظر آرہا تھا اچلا کو یقین آگیا کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے، اب وہ پیار کی باتیں کر رہی تھی، مگر رام گدکری کانفرنس کا قضیہ لے بیٹھے تھے،

گھر پہنچ کر اچی نے اپنے پتی کو سامان بھی ٹھیک سے نہ رکھنے دیا، وہ ایک بچی کی طرح مچل گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر بیڈروم میں لے گئی اور اس کے گلے لگ کر زار زار روتے لگی،۔۔ رام گدکری حیران ہی تو رہ گیا۔ ارے گیارہ ہی دن تو لگے ہیں،

لیکن اچی رو رہی تھی، اور مچل رہی تھی، اسے لپٹاتے، دلاسا دیتے ہوئے آخر میں رام نے کہا، مجھے کیا معلوم تھا تم اتنا ہی ڈر جاؤ گی،

'میں یہ سب ڈر کے مارے کر رہی ہوں؟' اچلا نے ایک دم پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، پیار کے مارے اور رام گدکری ہنس دیا۔ آگے بڑھ کر پھر سے اچی کو کلاوے میں لیتے ہوئے بولا، "میں جانتا ہوں اچے، میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں۔ بس"؟

'اس سے بھی زیادہ'

جھوٹے کہیں کے مجھ سے پیار کرتے تو یہ ۔۔۔ مونچھیں رکھتے؟

اچلا کا خیال تھا رام نے مونچھیں کسی لڑکی کی انگیخت پہ رکھی ہیں، رام سمجھ گیا اسے اچلا کے جذبات سے زیادہ اپنے سمجھ جانے پہ خوشی تھی، پیار میں اس نے

منہ آگے بڑھایا تو اچلا نے اپنا منہ پیچھے کی طرف موڑ لیا بس پہ رام نے وعدہ کیا کہ اگلے ہی روز وہ مونچھیں داڑھی سب منڈوا ڈالے گا۔ اپنی ہی نہیں جو بھی دکھائی دے گا اس کی بھی۔

دو ایک روز کے بعد وعدے کے مطابق، موہن جام چلا آیا۔ پہلے تو اچلا کچھ جھجکی، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے پتی رام گدگری کی طرف لپکی اور بولی جی میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں بس، میں نے اپنا ایک بھائی بنایا ہے۔

"بھائی بنایا ہے؟"

"ہاں" اچلا کہنے لگی: "کیا بھائی نہیں بناتے؟"

اور اس طرح رام گدگری کو پکڑ کر اچلا موہن جام سے ملوانے کے لیے اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ دونوں مرد ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے وہ ناسمجھی کے عالم میں ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ رام گدگری نے موہن جام کو ٹھیک طریقے سے اٹھایا بٹھایا نہیں یا اس کی مناسب خاطر مدارت نہیں کی۔ اس نے سب کچھ کیا لیکن وہ ایسے ہی تھا جیسے آدمی کچھ نہیں سمجھتا مگر کیے چلا جاتا ہے مسکراہٹیں بناوٹی تھیں، ہنسی بناوٹی۔ ہی ہی ہی۔۔۔

اور اچلا تھی کہ لٹی جا رہی تھی، ایک بار بھائی کہہ دینے کے بعد جیسے چھٹی ہو گئی تھی۔

اس نے نہ صرف چائے ختائی وغیرہ سامنے رکھیں بلکہ روزی کو بھی بازار بھیج دیا، کچھ نمکین چیزیں لانے کے لیے۔ رام گدگری یہ سب برداشت کر رہا تھا لیکن ایک چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ یہ تھی، کہ موہن جام کے آتے

بہر اچلا اسے کیوں بھول چکی تھی، جو اس کا پتی تھا، اس کے بھائی کا چچا! اور رام گدکری دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں اچلا کتنی بے بس ہے۔

جب کوئی چیز لینے کے لئے اچلا اندر جاتی تو یہ مرد لوگ ایک دوسرے سے سرسری طور پر تکلف محض تکلف ایک آدھ جملہ کہتے۔ رام گدکری کچھ کانفرنس کا رعب ڈالنے کی فکر میں تھے اور موہن جام اس مال کی شپ منٹ کا ذکر کر رہے تھے جو انہوں نے ابھی ابھی جاپان سے منگوایا تھا۔ دونوں فقرے بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔

اچی اندر سے آئی تو اس نے ساری بھی بدلی ہوئی تھی اور سامنے کے بالوں کا پھر سے کراؤن بنا لیا تھا، اور خوشی تو اس کے ساتھ ہی باہر لپکی آئی تھی۔

"بھابی نہیں آئیں بھائی صاحب؟" اچلا نے پوچھا اور پھر رام گدکری کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ کشمیر گئی ہیں۔ میں تو ملی نہیں۔ سنا ہے بڑی اچھی خوبصورت ہے۔"

"ضرور اچھی ہوگی۔" رام نے اتفاق کیا۔

"اور رام پھر ایک متعجب سی نگاہ سے موہن جام کی طرف دیکھنے لگا۔

سب کچھ کھا چکنے اور مصافحے کے بعد موہن جام اٹھ کر چل دیا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اچلا دروازے تک اسے چھوڑنے گئی۔ اور پھر کسی خیال کے آ[illegible] سے وہ دروازے سے نکل کر لینڈنگ تک، اور پھر لینڈنگ سے بھی نیچے چلی گئی حالانکہ اس کا شوہر مہمان کو رخصت کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے محض تکلفاً اٹھا تھا۔ یوں بھی سالے بہنوئی میں سالے کا رشتہ چھوٹا ہوتا ہے۔

نیچے، بازار میں آنے سے پہلے موہن جام کا جی چاہا کہ وہ اچی سے پیار کرے اچی کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ سکا جیسے اس نے کچھ پیار سے دبا دیا اور بولا "اچی! کبھی تم میرے ہاں آؤ نا۔"

"آؤں گی" اچی نے کہا۔ "ان کو بھی لاؤں گی۔"

اس کے بعد اچلا گاڑی تک چلی آئی۔ موہن جام رخصت ہوئے تو اچلا اور موہن دونوں۔۔۔ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اچلا اتنی ہی تیزی سے اوپر آگئی۔

رام گدگری، کو اچلا نے سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ بولتی چلی گئی۔ "دیکھئے میرے بھائی صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، لاکھوں میں ایک۔۔۔"

رام سر ہلاتا گیا حالانکہ اس کے ماتھے پر تیوریاں تھیں۔ "یہ بیچ میں خواہ مخواہ سا بھائی آ ٹپکا، اس کی ضرورت کیا تھی۔ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ جبھی تو اس نے کہا: "اگر سچ مچ تمہارا بھائی کا رشتہ ہے تو بھائی صاحب کیوں کہتی ہو، بھیا جی کیوں نہیں کہتیں؟"

"لو یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟"

اور اچلا بدستور موہن کے گن گاتی گئی۔ کیسے وہ دیبی کے ساتھ سیر کر رہی تھی تو کچھ موالی پیچھے لگ گئے۔ اگر موہن جام وہاں نہ ہوتا تو جانے کیا ہوتا اور اچلا کو اس رشتے کی صحت اور صفائی جتانے کے لئے اور بھی بہت سے جھوٹ بولنے پڑے۔ جن کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ یہ رشتہ بھگوان نے نہیں انسان نے بنایا تھا۔

اس کے بعد ایک دوبار موہن جام آیا اور اچلا اسی طرح سے بے اختیار اور بے خود پلکی بھپکی۔ موہن جام کے چلے جانے کے بعد رام گدکر ٹی زیر لب خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ اپنی خاموشی انہیں خود ہی ناگوار سی محسوس ہونے لگی سامنے طاق پر ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا جس کی سوئی گھماتے ہوئے رام نے اچی سے کہا۔

"جانتی ہو ٹرانسسٹر کسے کہتے ہیں"؟

"یہی جو سامنے پڑا ہے"۔

"نہیں" رام نے کچھ خفگی اور کچھ مسکراہٹ کے ملے جلے جذبات میں کہا "سٹر بہن کو کہتے ہیں، اور ٹرانس سسٹر وہ بہن ہوتی ہے جو سگی نہ ہو، ایسے ہی بھاڑے لے کر بنائی ہو، اسی لیے تم بہت شور مچاتی ہو"۔

اچلا کو بہت غصہ لگا "کیا مطلب؟ آپ بہن اور بھائی کے رشتے پر شک کرتے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

"میرا مطلب ہے ..."

"میں سب جانتی ہوں" اچلا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ تم مرد لوگ سب کمینے ہو تمہاری نظروں میں کوٹ کوٹ کر غلاظت بھری ہے۔ کیا دنیا میں مرد عورت پتی پتنی بن کر ہی مل سکتے ہیں؟ کیا سنسار میں ... اور اچی کا گلا بھر آیا تھا۔ وہ روتی ہوئی کیبنٹ کے سامنے بھگوان کی تصویر کے پاس جا کر دوزانو ہو گئی اور دہائی دینے لگی "میں نے کوئی بھی پاپ کیا ہو بھگوان تو میرے شریر میں کیڑے پڑ جائیں کوڑھ چل جائے"۔

رام اب پچھلنے لگا تھا۔ اس نے پیچھے سے آ کر اچلا کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا لیکن اچلا نے اس زور سے جھٹک دیا کہ رام دیوار کے ساتھ جا لگا، سر پہ معمولی سی چوٹ بھی لگی۔ اچلا اتنی تندرست تھی کہ رام گدکری ایسے اکہرے بدن والے آدمی کا اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر وہ اندر جا کر اپنے آپ کو بستر پر گرا کر اونچے اونچے رونے لگی۔ رام اب بہت ہی پچھتا رہا تھا، اور آپ جانتے ہیں پچھتائے ہوئے مرد کی کیا مشکل ہوتی ہے۔ رام کی ساری شام اچلا کو منانے میں لگی۔ حالانکہ وہ برلا منتو شری سبھا گھر میں ولایت حسین کے ستار سننے کے لئے جانے والا تھا۔ اور اچلا کے لیے بھی ٹکٹ خرید کر لایا تھا۔ جواب اس نے اپنی حسین مگر غصیلی بیوی کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیئے۔ پھر وہ وہیں بستر پر پڑی گھُرکی اس ستار کی کمر میں بازو ڈال کر اس سے تار درست کرنے لگا۔ چونکہ، نہ تھا اس لئے ایک بھی سُر ٹھیک نہ نکلا۔ آخر اِس نے کہا بھی تو صرف اتنا: "میں تم پہ اتنا سا بھی شک کروں اچلے، تو گائے کھاؤں، میں تو صرف یہ کہتا ہوں تمہارے اپنے بھائی بھی تو ہیں۔"

"کہاں ہیں" اچلا بولی۔ "ایک کلکتہ میں رہتا ہے دوسرا بجواڑہ میں۔"

پچھواڑے میں بھائی کا ہونا ضروری ہے۔

"ہاں ضروری ہے۔" اچلا نے سر کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی تو ہو تم سے پوچھنے والا۔"

رام گدکری پھر نہ سمجھا۔ بڑی مرگھلی سی آواز میں اس نے کہا۔ "تمہاری مرضی لیکن میں تو سمجھتا ہوں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

تمہیں مونچھیں رکھنے کی ضرورت تھی ؟"
مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد سومترا چلی آئی۔
سومترا پہلے سے واقعی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے کی بھی صحت پہلے سے اچھی تھی۔
وہ کاشمیری زبان کے چند لفظ سیکھ آیا تھا جنہیں بلا وجہ بے جا طور پر استعمال کرتا رہتا تھا۔ سومترا بار بار اسے پکڑ کر کہتی "ڈیڈی کو یہ سناؤ، ڈیڈی کو وہ سناؤ" لیکن وہ بدمعاش وہی رٹے ہوئے فقرے دہراتا، بعد میں پتا چلا کہ وہ کشمیری زبان کی گندی گالیاں تھیں۔
موہن جام نے اچلا کی سی حماقت نہ کی۔ سومترا سے اچلا کی ملاقات کرانے سے بہت پہلے اس نے کہہ دیا تھا۔ اس نے ایک بہن بنائی ہے۔
سومترا سنتی رہی، اسے اپنے موہن پر پورا بھروسہ تھا۔ نہیں وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے لاابالی پن سے محبت کرتی ہیں اور یا ان کی صحت اس درجہ خراب ہوتی ہے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں اور زندگی کو ہر حالت میں موت پر ترجیح دیتے ہوئے کچھ ایسے فقرے کہتی ہیں "جھک مارتے ہیں تو مارتے پھریں" اور پھر بھگوان کو جواب انہیں دینا ہے، مجھے تو نہیں دینا"
آخر رات کو چپکے میں ایسی آوازیں روتی ہیں جو انہیں خود بھی سنائی نہیں دیتی۔
سومترا نے کہا بھی تو صرف اتنا "ضرورت کیا تھی۔ تمہاری اپنی بہن جو ہے

اس پہ نچھاور کر دو اپنا پیار۔" یا " ایسی ہی کوئی پبلک کی باڑھ آئی ہے۔

" ہاں ۔ موہن نے قدرے درشتی سے کہا۔

سومترا دب گئی۔ صحت تو خراب ہونا ہی تھی، ابھی سے کیوں شروع ہو، اس نے جواب کے انداز میں سوال کیا " رادھا کیسی ہے "؟

" میں تو اس سے ملا نہیں "

" ہائے رام! جب سے میں گئی ہوں اپنی بہن سے نہیں ملے "؟

" وقت نہیں ملا "۔

" اور وہ خود بھی آئے ہیں ۔ ... رادھا اور کیلاش پتی "؟

آئے تھے تین چار بار ... لیکن میں ہی گھر پہ نہ تھا "

سومترا کہنا چاہتی تھی، ملتے بھی کیسے، وہ تو سگی بہن تھی، بنائی ہوئی تھوڑے تھی لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کی صحت ابھی بہت اچھی نہ تھی۔

اور پھر موہن جام نے یہ کہہ دیا " چوبیس کو رکھشا کا تہوار ہے، جاؤں گا اور مل آؤں گا "

رکھشا کے دن موہن جام پاریل اپنی بہن رادھا کے ہاں پہنچا۔ ساتھ سومترا بھی تھی۔ رادھا یوں پر پھیلائے لپکی جیسے برسوں کے بعد ملی ہو ... اسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور نہ موہن کو اپنے مرد ہونے کا پتا تھا اس نے رادھا کو گال سے چوم لیا۔ پھر سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر بہن کی آنکھوں سے شکایت کے آنسو پونچھے۔

کچھ دیر کے بعد رادھا بڑے مزے سے اٹھی اور لکڑی کی جالی میں سے

مٹھائی کی طشتری اٹھالی۔ پھر چوکی سامنے رکھ کر بھائی کو بٹھایا، اس کا منہ پورب کی طرف کیا، جاجو، موہن کا بچہ بھی ساتھ دوسری چوکی رکھ کر بیٹھ گیا، جیسے اشٹمی کا لینکڑا ...

"ارے" رادھا نے جاجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پہلے تو راکھی بندھوائے گا ؟"

"ہاں" جاجو نے گھڑا سا سر ہلادیا۔

"پہلے تو میں اپنے بھائی کے باندھوں گی ؟"

"نہیں پہلے میرے باندھو۔"

ایسا ہی حکم چلاتا ہے" رادھا پیار سے بولی "تو بھگوان سے کہہ تجھے بھی ایک بہن لادیں چھوٹی سی - جو ہر سال راکھی باندھا کرے"۔

اور ایسا کہنے میں جاجو، موہن اور کیلاش پتی تینوں نے سومترا کی طرف دیکھا جس نے شرما کر منہ ساری میں چھپالیا۔

رادھا نے موہن بھیا کی کلائی پہ سادہ سی مولی کی راکھی باندھی، منہ میں میٹھے کا ایک ٹکڑا ڈالا۔ موہن نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رادھا کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ رادھا نے دس کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگایا اور پیار تھا کہ یہ دن ہر بہن کے لیے آئے بھگوان۔ اور اس کی آنکھوں میں پیار کی نمی تھی۔

سومترا اور بچے کو گھر چھوڑ کر موہن جام اپلا کے ہاں جانے کے لیے نکلا وہ سومترا کو بھی لے جانا چاہتا تھا، مگر اس روز نہیں، اس کی کوئی خاص وجہ تھی، عورتیں کئی باتوں میں مردوں کو خواہ مخواہ روکتی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو،

وہ نہ کرد۔" جیسے عورتوں کی بہت سی باتیں مردوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اسی طرح مردوں کی عورتوں کے پلے نہیں پڑتیں۔

موہن بازار میں کپڑے کی ایک دکان پہ گیا۔ بہت کچھ الٹ سلٹ کے بعد ایک بنارسی ساری ملی جس پہ ہلکی ہلکی زردوزی کی گئی تھی۔ اس کی قیمت سوا تین سو روپلے طے ہوئی۔ موہن نے پیسے دیئے، ساری کو ایک خوبصورت سے گفٹ پیپر میں بندھوایا اور کانڈوسے پرسیہنہ سدن کے لیے چل نکلا۔

اپلا اپنے گھر میں بیٹھی قینچی ہاتھ میں لیے کچھ کتر بیونت کر رہی تھی جو صبح سے ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ رام گدکری کھڑکی میں کھڑا یوں ہی بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور پیچھے ٹیلر ماسٹر کی دکان پہ آتے جاتے ہر آدمی کے سر پہ اپنے سگریٹ کا گل جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبھی سامنے موہن جام کی کار آکر رکی پیچھے ہٹتے ہوئے رام گدکری نے آواز دی "اپی"۔

"جی" اپی نے بڑی مٹھاس سے جواب دیا۔

"وہ آیا ہے۔"

"کون وہ؟ بھیا جی"۔

"بھیا جی نہیں، چھیلا۔"

"چھیلا؟"

"ہاں۔ تو اچلا ہے نا۔ اور وہ چھیلا۔"

جب تک موہن دروازے پہ آچکا تھا اور گھنٹی بجا چکا تھا، رودزی

رام گدکری کا خیال تھا موہن اس دن نہیں آئے گا۔۔۔ اگر وہ رکھشا بندھن کے لئے آ گیا تو پھر وہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا۔ پھر تو۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ اور موہن آگیا تھا جس کے لیے اچی صبح ہی سے کلابتون اور جھل مل اور نہ جانے کن کن چیزوں کی ایک خوبصورت راکھی بناتی رہی تھی۔ رادھا کی غریبانہ، معمولی کے دھاگے کی راکھی تو موہن نے اتار کر کہیں پھینک دی تھی اور بھاگ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی، اور اس کی یوں آؤ بھگت کی جیسے کوئی کسی راجہ کی کرتا ہے۔

رام گدکری ہمیشہ کی طرح سمجھ رہا تھا اور نہیں بھی سمجھ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں موہن جام پورب کی طرف منہ کیے پیڑھی پہ بیٹھا تھا، اور رام گدکری کچھ پرے سے بے اعتنائی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جبھی اچلا آئی۔ اس نے ایک بہت خوبصورت قمیض اور شلوار پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں پیاز کے چھلکے کی طرح کا ایک دوپٹہ تھا جس نے اچی کے گلے اور سینے کو صحت کا رنگ دے دیا تھا۔ فٹ سی قمیض نے چھاتی، کمر اور نچلے حصے کی بہت ہی خوبصورت حد بندیاں کر رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس میں رکھی ہوئی مٹھائی پہ سونے کے ورق کانپ رہے تھے۔ اور اس کے ایک طرف راکھی تھی جس کی جھل مل میں کچھ سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔

موہن نے بڑی محبت سے ہاتھ بڑھایا۔ اچلا نے جب موہن کی کلائی پہ راکھی باندھنا شروع کی تو رام گدکری کو اس کے ہاتھ خوشی سے کانپتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر موہن نے گفٹ پیپر کھولا اور اس میں سے ساری نکالی اس پہ سنہ

روپے کا نوٹ رکھا اور دونوں چیزیں اچلا کی طرف بڑھا دیں ۔

رام گدکری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے پھیلیں اور پھر معمول کی سی ہو گئیں ۔

رکھشا کی یہ رسم ادا کرتے میں اچلا بھی خاموش تھی ، اور موہن بھی ، دونوں کے بدن میں ایسا کہیں ہاتھ چھو جانے سے ایک بجلی سی دوڑ گئی تھی ، پھر اچلا نے دھیمی سی آواز میں کہا " یہ دن بار بار آئے بھگوان - اور جب موہن نے اچلا کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں حیا کی سرخی تھی ۔

کچھ دیر یونہی سی گفتگو کے بعد موہن نے رام گدکری سے ہاتھ ملایا ، اچلا سے نمستے کی اور چل دیا ، دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک آہ بھری جسے کسی نے نہ دیکھا ۔ پھر وہ نیچے چھوڑنے کے لئے جانا چاہتی تھی لیکن آج اس کے پیر جیسے دب گئے تھے ۔

" تمہیں خوش ہونا چاہیے اچی " رام نے کہا " بھائی کو راکھی باندھی ہے "

" ہاں " اچی نے کہا " آج صبح ہی سے میری طبیعت کچھ ...."

" صبح ہی سے تو یہ سب بناتی رہی ہو - سب اکٹھا کرتی رہی ہو ۔

اچلا نے سر ہلا دیا ۔۔ رام نے آگے بڑھ کر کہا " میں تو سمجھتا تھا تم اپنے بھائی کی دی ہو ساری پہن کر مجھے دکھاؤ گی ۔

اچی نے جواب نہ دیا ۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوتے دیکھ کر رام گدکری نے آگے بڑھ کر اُسے تھام لیا اور بڑے پیار سے بولا " کیا ہو گیا میری اچی کو "

" کچھ نہیں " اچو نے ایک دھیمی سی آواز میں کہا اور پھر اپنا بازو رام کے گرد

ڈالتے ہوئے بولی "مجھ سے پیار کرو"۔
رام نے اچی کو سینے سے لپٹا لیا اور بھینچنے لگا۔
"اوہ۔۔۔" اچی نے کہا۔
اس کے بعد اچی کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا جب تک موہن جام اچلا اور رام گدکری کے خیالوں سے کہیں پرے جا چکا تھا۔

٭ ٭ ٭

ختم شد

خوشنویس۔۔۔۔ محمد ارشد چھٹہ چوپالوی۔

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اول)	قرۃ العین حیدر
״ ״ ״ (حصہ دوم)	״ ״
آگ کا دریا	״ ״
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	״ ״
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	״
زیرِ لب	صفیہ اختر
حرفِ آشنا	״
گنجے فرشتے	منٹو
انارکلی	״
ٹھنڈا گوشت	״
کرنیں	شفیق الرحمٰن
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی
زرد پتے	خلیل جبران
پاگل	خلیل جبران
محبت اور جوانی	״ ״
ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر
پھول کی تنہائی	״ ״
الٹا درخت	״ ״
محبت کی رات	״ ״
مضامین کرشن چندر	״ ״
لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
آتشِ گل	״ ״
کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
تلخیاں	״ ״
گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری

مکتبۂ اردو ادب لاہور